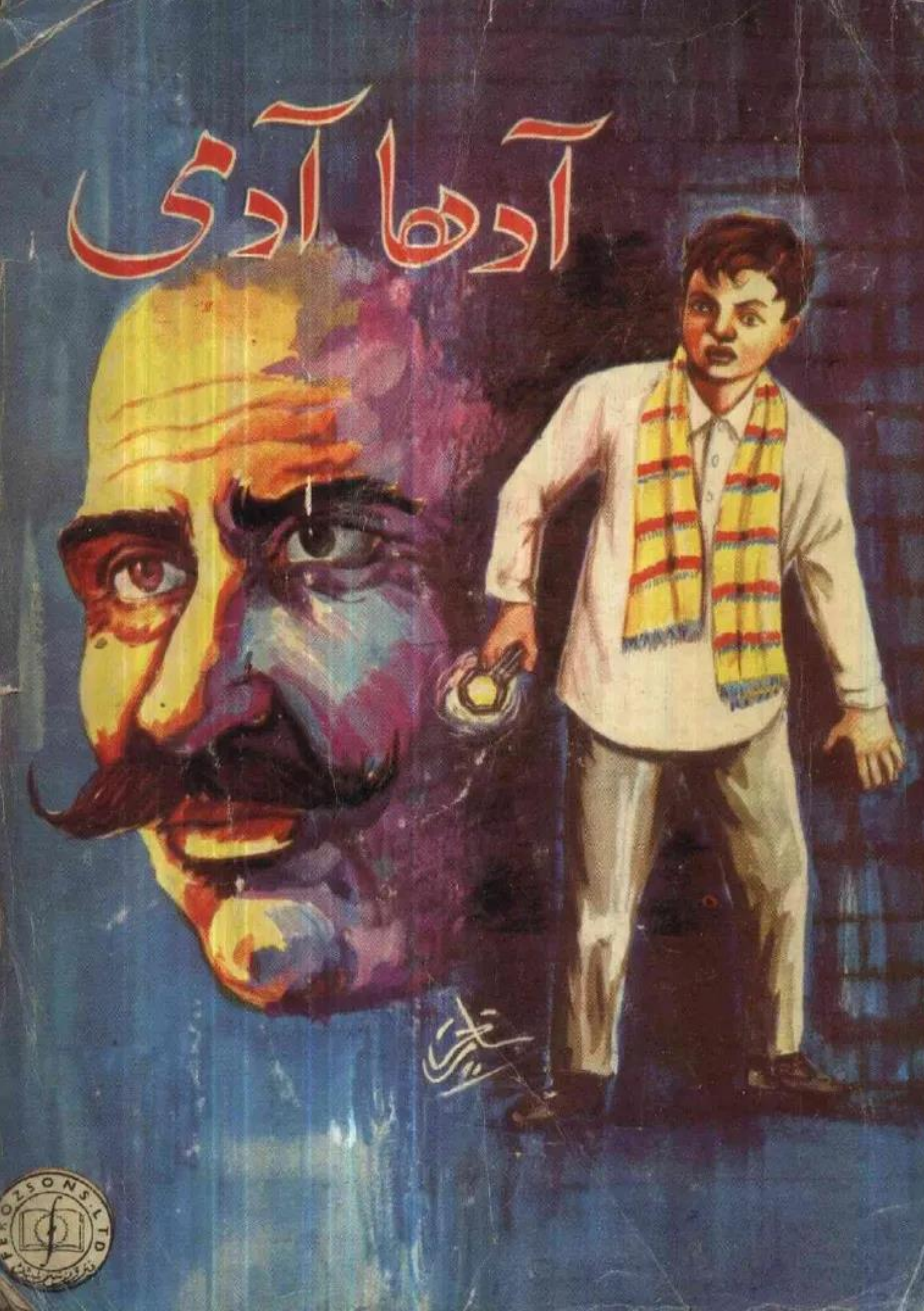

آدھا آدمی
FEROZSONS LTD

آدھا آدمی

دلچسپ کہانیاں

جبّار توقیر

۱۹۶۸

فہرست

آدھا آدمی

باہر گھپ اندھیرا تھا۔ جیسے ہی میں نے دروازے سے گلی میں قدم رکھا، کُتّوں کی ایک پوری فوج میری طرف لپکی، مگر پھر وہ مجھے اپنی گلی کا آدمی سمجھ کر پیچھے ہٹ گئی۔ ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی اور میرا دھیان اپنی امّی کی بیماری پر لگا تھا۔ ابّا جان اپنی نوکری کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے تھے اور ہم اپنے اس شہر میں بڑی بے سہاراسی زندگی گزار رہے تھے۔ امّی پچھلے کئی دنوں سے بیمار تھیں اور اس رات بارہ بجے کے قریب اچانک ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ باجی کے تو ہاتھ پاؤں پھُول گئے۔ انہوں نے مجھے اسی وقت کمبل دیا جسے اوڑھ کر میں نے ٹارچ ہاتھ میں لی اور ڈاکٹر کو بُلانے کے لیے چل دیا۔ میرے دائیں ہاتھ میں لاٹھی تھی جسے فرش پر مارتا ہوا میں تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

ڈاکٹر رفیق اسٹیشن سے پار کرم آباد میں رہتا تھا۔ پھاٹک میں سے گزر کر جب میں کرم آباد پہنچا تو اس وقت ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ کئی گلیوں کے چکر کاٹ کر

ڈاکٹر کا گھر آتا تھا۔ زندگی میں وہ پہلا موقع تھا کہ مجھے آدھی رات کو گھر سے باہر نکلنا پڑا تھا۔ مگر معاملہ اس قدر اہم تھا کہ مجھے ہر قیمت پر اسی وقت ڈاکٹر کے گھر پہنچنا تھا۔

گلی حکیماں کی جانب مُڑا تو وہاں گھُپ اندھیرا چھا چکا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ٹارچ کی روشنی جلائی، اچانک ایک کونے میں کوئی آدمی کھڑا نظر آیا۔ بے خیالی میں ٹارچ کا رُخ اس کی طرف ہو گیا۔ اب مجھے اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں اسے دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کی شکل صورت کُچھ آشنا سی معلوم ہوئی میں نے کوئی دھیان نہ دیا۔ اس نے سر پر پٹکا باندھ رکھا تھا۔ مونچھیں بازاری مونچھوں سے بھی زیادہ اکڑی ہوئی نظر آتی تھیں اور وہ بڑے خوفناک انداز سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں بھورے رنگ کے کینوس کے جوتے تھے اور اس نے سلیٹی رنگ کا کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ اسے دیکھ کہ ایک انجانا سا خوف مجھے محسوس ہوا اور میں بائیں طرف ہو کر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا آگے نکل گیا۔

گلی کے عین وسط میں حکیم نوازش علی کا عالی شان مکان تھا۔ عجیب بات تھی کہ اس گلی میں بھی روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا حالانکہ وہاں اچھے کھاتے پیتے لوگ رہتے تھے۔ ہمارا محلہ تو ویسے ہی ہم ایسے غریبوں سے اٹا پڑا تھا جہاں دِن کو بھی روشنی نہ پہنچے تو کوئی فرق نہیں پڑتا، مگر کرم آباد جیسے محلّے میں اور وہ بھی گلی حکیماں جیسی جگہ میں روشنی کا نہ ہونا بڑی اچنبھے کی بات تھی۔ گلی میں گھُپ اندھیرا تھا اور میں اپنی ٹارچ کی روشنی میں تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

جب میں نوازش علی کے تین منزلہ مکان کے سامنے پہنچا تو وہاں مجھے دوسری منزل کی بالکنی میں سے ایک موٹا سا دُہرا رسّا نیچے لٹکتا نظر آیا۔ میں نے ٹارچ بند کرلی کہ راستہ بالکل صاف تھا۔ میں اطمینان سے آگے بڑھ سکتا تھا۔ مگر میرے ذہن میں وہ رسّا لٹک کر رہ گیا۔ میں نے زیادہ تدّد نہ کیا اور اندھیرے میں آگے بڑھنے لگا۔ مگر آٹھ بیس قدم آگے جا کر اچانک میرے پاؤں رُکنے لگے۔ گلی میں کسی کے تیز تیز چلنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ اس وقت گلی میں کون جارہا ہے، ٹارچ کی روشنی پیچھے ڈالی تو مجھے حکیم نوازش علی کے مکان سے ذرا آگے تین آدمی نظر آئے جو تیزی سے دوڑتے ہوئے دوسری طرف جا

رہے تھے۔ ان میں سے دو آدمی اپنے ہاتھوں میں صندوق اُٹھائے ہوئے تھے اور تیسرا آدمی وہی کمبل پوش معلوم ہوتا تھا جسے میں نے تھوڑی دیر پہلے کونے میں کھڑا دیکھا تھا۔ ٹارچ کی روشنی جب ان پر پڑی تو وہ دُبک کر دیوار کے ساتھ لگ گئے اور بھاگتے ہوئے گلی کے چوک میں پہنچ کر دائیں طرف مُڑ گئے۔ میں نے اُن کو یوں چوروں کی طرح دبے پاؤں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے دیکھا تو بڑا حیران ہوا۔ میں نے حکیم نوازش علی کے مکان کی اس بالکنی پر پھر جو روشنی کی تو وہاں اب وہ رسّا موجود نہ تھا۔

میرے پاس ان سب باتوں پر غور کرنے کے لیے وقت ہی کہاں تھا۔ جونہی وہ لوگ نظروں سے اوجھل ہوئے، میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ڈاکٹر رفیق کے مکان کی طرف لپکا۔ وُہ شریف آدمی اس وقت گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ میں نے بہر حال دس پندرہ منٹ تک متواتر دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد اُسے جگایا۔ خُدا اس کا بھلا کرے، وہ اسی وقت میرے ساتھ چلنے کے لیے تیّار ہو گیا۔ اس کے پاس ایک اسکوٹر تھا۔ مجھے اس نے پیچھے بٹھایا اور پیچدار گلیوں کے بجائے وہ کشادہ سڑک سے ہمارے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ امّی کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی

مگر آفرین ہے اس ڈاکٹر کی قابلیت پر کہ وہ انہیں ایسی دوا دے کر گیا کہ صبح تک امّی جان کی تکلیف بڑی حد تک رفع ہو چکی تھی۔ صبح کوئی آٹھ بجے کے قریب میں ڈاکٹر رفیق کے مطب دوا لینے اسی راستے سے روانہ ہوا۔ اس کا مطب اس کے گھر کے قریب ہی تھا۔، جب میں حکیم نوازش علی کی گلی میں پہنچا جسے لوگ گلی حکیماں کہتے تھے تو وہاں حکیم صاحب کے مکان کے سامنے لوگوں کا جمگھٹا تھا۔ گلی میں دو چارپائیاں بچھی تھیں جن پر پولیس کے سپاہی بیٹھے تھے۔ تھانیدار بھی وہیں گلی میں کرسی ڈال کر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے چھوٹی میز تھی جس پر کچھ کاغذ رکھے ہوئے تھے اور تیزی سے ان کاغذوں پر کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ مجھے فوراً ہی اس بھیڑ بھاڑ کی وجہ معلوم ہو گئی۔ حکیم صاحب کے گھر سے رات چوروں نے ان کا سارا قیمتی اثاثہ چُرا لیا تھا۔ نقصان کا اندازہ بیس ہزار کے لگ کیا تھا جس میں صرف زیورات ہی دس ہزار روپے کے تھے۔ چھ ہزار روپیہ نقد اور چار ہزار کے قیمتی پارچات۔ پولیس والے بار بار پارچات پارچات کہہ رہے تھے اس لیے مجھے یہ لفظ خاص طور پر یاد رہ گیا۔ وہ لوگ نقصان کی تفصیلات لکھ رہے تھے اور کاغذ پر کاغذ سیاہ کیے جا رہے تھے۔ پچھلی رات کا سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم

گیا۔ میں اُس بھیڑ میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ کوئی شخص بھی میری طرف متوجہ نہ تھا۔ اور یہ میری بہت بڑی کمزوری ہے کہ میں آگئے بڑھ کر جرأت کے ساتھ ایسے معاملوں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پولیس والوں سے ویسے ہی مجھے خوف آتا ہے۔ ابّا جان کی یہی نصیحت تھی کہ جہاں کوئی ایسا معاملہ نظر آئے آنکھیں بند کر لینی چاہیں۔ اُنہیں کسی گواہی کے سلسلے میں بڑا تلخ تجربہ ہوا تھا۔ وہ چوروں کو بھی گالیاں دیا کرتے تھے اور پولس والوں کو بھی۔ اور میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئی تھی کہ مجرموں کو تو بُرا بھلا کہنا ہی چاہیے مگر ہمارے جان و مال کی محافظ پولس کو بُرا کہنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی اس معاملے میں اُن سے کچھ کہوں مگر مجھے پتا ہی کیا تھا۔ میں کچھ بھی نہ کہہ سکتا تھا۔ ایک چور کی صورت مجھے کچھ دیکھی بھلی سی معلوم ہوتی تھی مگر مجھے یاد نہیں پڑتا تھا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا تھا۔ اس کے دائیں رخسار کی ہڈّی پر ایک انچ لمبا زخم تھا اور یہی نشان میرے ذہن میں بار بار اُبھرتا تھا۔ یا وہ اس کی خوف ناک مونچھیں، پاؤں میں بھورے رنگ کے ربڑ کے جوتے پہن رکھے

تھے۔ اس کی شلوار بھی سلیٹی رنگ کی تھی ۔ میرا خیال ہے وُہ ملیشیے کی شلوار تھی۔

میرے قریب ہی ایک بھلا آدمی کھڑا تھا۔ یونہی میں نے اُسے متوجّہ کر کے کہا۔

"یہ چوری رات کے ایک بجے ہوئی ہے۔ میں اس وقت اس گلی میں سے گزر رہا تھا۔"

اس آدمی نے تیز تیز نظروں سے جھک کر مجھے دیکھا اور بولا۔

"تو یہاں کیا کر رہا تھا اس وقت۔"

"مم۔۔۔ مم۔۔۔۔ میں اس وقت ڈاکٹر رفیق کو بُلانے جا رہا تھا۔ میری امّی جان بیمار تھیں۔" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ میں ایک دم اس کے سوال سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔

اس پر دو چار آرمی اور بھی میری طرف متوجّہ ہو گئے۔ ایک آدمی نے اچانک بلند آواز سے کہا۔ "حکیم صاحب اس لڑکے نے چُوروں کو دیکھا تھا۔ یہ اس وقت گلی میں سے گزر رہا تھا۔" اس پر ایک چاق وچوبند بوڑھا آدمی، جو تھانیدار کے قریب ہی کُرسی اس اُداس بیٹھا تھا، لپک کر میری طرف بڑھا۔

لوگوں نے مجھے دھکیل کر تھانیدار کے قریب کر دیا۔

"تم نے چوروں کو دیکھا تھا؟" "کیا تُم ان کو جانتے ہو؟" اُس بوڑھے آدمی نے تیزی سے پُوچھا۔ وہی حکیم نوازش علی تھے۔ تھانیدار چُبھتی ہوئی نظروں سے مجھے ٹٹولتے ہوئے مُسکرایا اور بولا۔

"اس ننھے میاں کو اِدھر لے آئیں حکیم صاحب۔ آیار تو اِدھر بیٹھ جا۔ تُو تو بڑے کام کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

"آدمی کہاں ہے جی یہ تو آدمی کا بچّہ ہے۔" ایک موٹے سے سپاہی نے بھونڈے انداز سے کہا۔ سچّی بات تو یہ ہے سپاہی کی فقرہ بازی پر مجھے بڑا تاؤ آیا۔ لیکن بہت سے لوگوں کی باچھیں کِھل گئیں۔ حکیم صاحب نے مجھے چارپائی پر بٹھا دیا۔ اب سب لوگوں کی نظریں میری طرف تھیں۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" تھانیدار نے پُوچھا۔

"جی میرا نام یونس ہے، محمد یونس۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "کتنی عُمر ہے تمہاری؟"

"جی میری عُمر چودہ سال ہو گی۔" اب کے میں نے زیادہ دلجمعی سے کہا۔ اب میرا حوصلہ بندھ گیا تھا۔

"کہاں رہتے ہو تُم؟"

"جی ہمارا گھر اُدھر اسٹیشن کے اس پار محلہ رسول نگر میں ہے۔"

"تمہارے ابّا کیا کام کرتے ہیں؟"

"جی وہ کراچی کے ایک سرکاری دفتر میں ملازم ہیں۔"

"تم رات اس گلی سے کتنے بجے گُزرے تھے؟"

"میں رات کو پونے ایک بجے اس مکان کے سامنے سے گُزرا تھا۔"

"تُم کس لیے اِدھر آئے تھے؟" تھانیدار نے پوچھا۔ وہ بُہت سنبھل سنبھل کر بات کرتا تھا، اور وہ مُوٹا سپاہی کاغذ پر تیزی سے کچھ لکھتا جارہا تھا۔

"میں ڈاکٹر رفیق صاحب کو بُلانے آیا تھا۔ میری امّی جان بُہت بیمار تھیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ جب تم اِس گلی میں سے گُزرے تو تمہیں کِس طرح معلوم ہوا کہ اس مکان میں چوری ہو رہی ہے۔" یہ ٹیڑھا سوال سُن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں ہاں بتاؤ تمہیں کس طرح یہ شک گزرا کہ یہاں چور گھُسے ہوئے ہیں۔"

"اس وقت تو مجھے معلوم نہیں ہوا جناب۔ اب میں پھر ڈاکٹر صاحب کی طرف آیا ہوں تو مجھے معلوم ہوا کہ یہاں چوری ہو چکی ہے۔" میں نے کہا۔

"کمال ہے۔ بھئی وہ کون تھا جو کہہ رہا تھا کہ اس لڑکے کو چوری کا علم ہے۔" تھانیدار نے بدمزا ہو کر اُونچی آواز میں کہا۔ وہی بھلا آدمی جس سے میں نے بات کی تھی آگے آ گیا اور بولا۔

"جناب یہ لڑکا ابھی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ یہ چوری رات ایک بجے ہوئی ہے۔"

"اچھّا، تمہیں وقت کا اندازہ کیسے ہوا؟ تم وہاں پر تھے؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"جی وُہ دراصل۔۔۔ دراصل بات یہ ہے کہ جب میں اس گلی میں سے گزرا تو میں نے ایک آدمی کو گلی کے اُس کونے میں کھڑا دیکھا۔ اس کے بعد جب میں آگے بڑھا تو یہاں حکیم صاحب کے مکان کی بالکنی میں ایک دوہرا رسّا لٹکتے دیکھا۔ میں نے آگے بڑھ کر جو گلی کے آخری موڑ پر پہنچ کر پیچھے مُڑ کر دیکھا تو مجھے تین آدمی تیزی سے گلی میں بھاگتے نظر آئے۔ ان میں ایک وہی شخص تھا جس نے کمبل اُوڑھ رکھا تھا اور اس کونے میں چھُپ کر اندھیرے میں کھڑا تھا۔" یہ کہہ کر میں

خاموش ہو گیا۔ سارا مجمع مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ تھانیدار بھی گہری نظروں سے مُجھے گھُور رہا تھا۔

"تم نے اسی وقت کِسی کو خبر دار کیوں نہ کیا۔" اس موٹے سپاہی نے پوچھا۔

"جناب میں کیا کر سکتا تھا۔ گلی میں گھُپ اندھیرا تھا۔ مجھے بڑا سخت خُوف محسوس ہو رہا تھا۔ پھر مجھے امّی جان کے لیے ڈاکٹر کو بُلانے کی جلدی تھی، اور یہ بات تو اس وقت میرے ذہن میں آئی ہی نہ تھی کہ وہ چوری کر کے جا رہے ہیں۔" میں نے بڑی دلجمعی سے کہا۔ اُس مکان کے اندر سے اچانک عورتوں کے چیخنے چلّانے کی آوازیں آنے لگیں۔ وُہ بلند آواز سے رو پیٹ رہی تھیں۔

"حکیم صاحب گھر میں جا کر انہیں حوصلہ دِلائیں۔ کب تک یونہی روتی رہیں گی۔ خدا کو منظور ہوا تو ہم چور کو پکڑ لیں گے۔" تھانیدار نے بے فکری سے کہا۔

حکیم صاحب اُٹھ کر مکان کے اندر چلے گئے۔ ان کے جانے کے چند منٹ بعد عورتیں خاموش ہو گئیں۔ شاید ان کی کوئی رشتے دار اظہارِ افسوس کے لیے آئی تھی جس کے آنے پر پھر سے واویلا شروع ہو گیا تھا۔ عورتوں کو تو ویسے ہی رونے کے لیے کوئی بہانہ چاہیے اور وہاں تو اچھا خاصا نقصان ہو چکا تھا۔ جس پر وہ جتنا

روئیں کم تھا۔ تھوڑی دیر لئے بعد حکیم صاحب واپس آئے تو تھانیدار پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ بولا۔

"کیا تم اس آدمی کو پہچان سکتے ہو؟"

"جی میرا خیال ہے کہ میں نے اس آدمی کو کہیں دیکھا ہے۔ اُس کی صورت آشنا سی معلوم ہوتی تھی۔" اس پر تھانیدار ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"تو کیا تُم اس آدمی کو جانتے ہو؟"

"جی نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس آدمی کو پہلے بھی کہیں دیکھا تھا مگر مجھے یہ بالکل یاد نہیں کہ کہاں دیکھا تھا۔ نہ ہی میں اس کا نام جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اوہ۔ میں سمجھا کہ شاید ہمیں تم اس آدمی کے متعلّق کچھ بتا سکو گے۔ اچھّا آج شام کو ہم تمہیں تھانے میں بُلا کر کُچھ آدمی دکھائیں گے۔ اگر وہ آدمی ان میں شامل ہوا تو مجھے یقین ہے کہ تم اسے ضرور پہچان لو گے؟" تھانیدار نے کہا۔ "اب تم جا سکتے ہو۔"

میں جانے کی اجازت ملتے ہی بھیڑ کو چیرتا ہوا ڈاکٹر کے مطب کی طرف چل دیا۔

دوا لے کر میں نے گھر پہنچائی۔ اُس وقت اسکول سے مجھے کافی دیر ہو چکی تھی، پھر بھی میں نے بستہ اُٹھایا اور اسکول چلا گیا۔ دوپہر تک وہاں رہا مگر پڑھائی میں بالکل بھی جی نہ لگا۔ رہ رہ کر اُس چوری کا خیال آتا تھا اور اس بدمعاش کا چہرہ ذہن میں اُبھرتا تھا اور میں یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے اُسے کہاں دیکھا تھا مگر یاد نہ آیا۔

دوپہر کے وقت ہی اسکول سے چلا آیا۔ شام ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے کہ ہمارے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے باہر جا کر دیکھا تو وہاں ایک لمبا تڑنگا جوان کھڑا تھا جس نے سفید شلوار اور سفید قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر اس نے جناح ٹوپی رکھّی ہوئی تھی اور پاؤں میں پشاوری چپل تھے۔ وضع قطع سے وہ کوئی پولیس کا سپاہی معلوم ہوتا تھا۔ وُہ مُجھے غور سے دیکھتا ہُوا بولا۔

"یونس تمہارا ہی نام ہے؟"

"جی یہ میرا ہی نام ہے"۔ میں نے کہا۔ مجھے خُوشی تھی کہ ایک بار پھر مجھے تھانیدار نے اس معاملے میں بہت اہم کام کے لیے بُلایا تھا۔

"تمہیں تھانیدار صاحب نے بُلایا ہے۔ وہ پُرانی کوتوالی میں بیٹھے ہیں۔" وُہ بولا۔

"اچھاتو ٹھہریے۔ میں ذرا امّی جان سے کہہ آؤں۔" میں نے کہا اور واپس مُڑ آیا۔

امّی جان اب پہلے سے اچھی تھیں ۔ بخار اُتر چکا تھا۔ اُن کو میں صُبح کی ساری سرگزشت بتا چکا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے ہاتھ سے ٹوپی پہنائی، قمیص بھی بدلوائی اور بولیں:

"وہاں جا کر تھانیدار کو تمیز سے سلام کرنا بیٹا۔ اور جو کچھ تمہیں معلوم ہو سچ اُن سے کہہ دینا۔ جا اللہ حافظ ہے۔" جب بھی میں کسی کام پر جاتا تھا تو وہ ہمیشہ مجھے دُعائیں دے کر رُخصت کیا کرتی تھیں۔ اُنہوں نے میری پیشانی چومی اور میں انہیں سلام کہہ کر باہر آ گیا۔

باہر اس آدمی نے مجھے مُسکرا کر دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گلی سے باہر لے آیا۔ وہاں سڑک ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس آدمی نے دروازہ کھول کر اندر بٹھایا تو وہاں پچھلی سیٹ پر ایک نے ٹھگنے قد کا آدمی اور بھی بیٹھا تھا۔ اس کے کپڑے میلے تھے اور اس کے بدن سے عجیب سی بدبو آ رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر کونے میں سِرک گیا اور میں ان دونوں کے درمیان پھنس کر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے فوراً کار چلا دی۔ وہ لوگ بالکل خاموش تھے۔ ان کی صورتیں بڑی سنجیدہ نظر آتی تھیں۔

انہوں نے مُجھ سے کوئی بات تک نہ کی۔ آدھ میل کا فاصلہ طے ہو چکا ہو گا مگر وہ منہ بند کر کے یوں بیٹھے تھے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

پرانی کوتوالی ہمارے مکان سے بڑی سڑک کے راستے سے تین میل دور تھی۔ کوئی ایک میل تک کار چلی ہو گی کہ اچانک اس ٹھگنے آدمی نے میری کمر کے پیچھے سے ہاتھ ڈال کر میرے بازو مضبوطی سے جکڑ کر اپنے بائیں ہاتھ سے ایک سفید رومال میری ناک پر یوں رکھا کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ زبان خشک ہو گئی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور جب میری آنکھیں کھلیں تو ایک چھوٹے سے کمرے میں دری پر خود کو پڑا پایا۔ میرے دونوں ہاتھ اور پاؤں یوں اکٹھے بندھے تھے جیسے گھوڑے کو کھُریاں لگاتے وقت مستری اس کے چاروں سُم باندھ لیتے ہیں۔ میرے مُنہ میں رومال ٹھنسا تھا اور اس رومال پر ایک مضبوط پٹّی بندھی تھی جس کی گرہ میرے سر کے پیچھے تھی۔ کمرے میں ایک ہلکا سا بلب روشن تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ مجھے وہ کمرہ کافی صاف ستھرا معلوم ہُوا۔ دری پر گرد کا ایک ذرّہ بھی نہ تھا۔ کونے میں ایک خوبصورت میز کے گرد چار کُرسیاں لگی تھیں۔ دوسری طرف ایک پلنگ پڑا تھا جس پر نیلے رنگ کی پھول دار چادر بچھی

تھی۔ دیواریں بالکل سفید چادر کی طرح تھیں۔ کمرے میں ایک کھڑکی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک دروازہ۔ یہ دونوں بند تھے۔ وہ اُونی چادر جو امّی جان نے مجھے اوڑھنے کے لیے دی تھی کہیں نظر نہ آتی تھی۔ میرے جوتے البتّہ ابھی تک میرے پاؤں میں موجود تھے۔ میں سرد کمرے میں دری پر پڑا تھا، سردی ہڈّیوں میں اُترتی جارہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ کِس لیے ان لوگوں نے مجھے وہاں باندھ کر ڈال دیا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ سارے دِن کے واقعات میرے ذہن میں اُبھرنے لگے اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ چُوروں نے محض اس ڈر سے مجھے اغوا کر کے قید کر دیا ہے تاکہ میں حقیقی مجرموں کا سُراغ لگانے میں پولیس کی مدد نہ کر سکوں۔

ساری رات میں وہاں اُسی حالت میں پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ کسی پہلو چین نہ آتا تھا۔ شاید میری بدقسمتی کا دور شروع ہو چکا تھا کہ وہاں اُن لوگوں نے مجھے بھُوکا پیاسا لا کر ڈال دیا تھا۔ اس کمرے کے اِردگرد مکمّل خاموشی تھی۔ بہت دیر کے بعد مجھے اس کمرے کی چھت پر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ پھر زیادہ آوازیں آنے لگیں

اور پھر کھڑکی کے شیشوں میں سے مجھے معلوم ہوا کہ پَو پھٹ رہی ہے۔ آہستہ آہستہ تاریکی چھٹنے لگی اور پھر صبح ہو گئی۔

میں بہت بُری طرح تھک چکا تھا۔ ساری رات خوف کی وجہ سے مجھے نیند نہ آئی تھی۔ کہتے ہیں نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے مگر اس رات نیند مجھ سے کوسوں دور رہی۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ بدن بُری طرح سُوکھ رہا تھا۔ حلق بھی کانٹے کی طرح سوکھ چکا تھا۔ نہ میری آواز نکلتی تھی نہ ہاتھ ہلتے تھے۔ بس بندھے ہوئے چوپائے کی طرح میں بڑے جھٹکے کے ساتھ کروٹ لے کر پہلو بدلتا تھا کہ ایک ہی پہلو کے بل لیٹے لیٹے میری پسلیاں بھی دُکھنے لگتی تھیں۔

دِن کافی چڑھ آیا تو دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز آئی۔ وُہ ٹھگنا، دروازہ کھلتے ہی نمودار ہوا۔ دروازہ اپنے پیچھے بند کر کے مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں کسی چیز سے بھرا ہوا گلاس تھا جسے اس نے میز پر رکھ دیا اور پھر میرے قریب آ کر اس نے اپنی جیب سے ایک لمباسا چاقو نکالا اور بولا۔

”اگر تم نے ذراسی بھی آواز نکالی تو یاد رکھو۔ اسی چاقو اسے میں تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔ اگر شرافت سے پڑے رہو گے تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ بولو تمہیں

ہماری شرط منظور ہے۔" اُس کی آواز بڑی کرخت تھی، میں نے بڑی بے چارگی کی نگاہ سے اُسے دیکھا تو وہ پھر بولا:

"زخمی بکرے کی طرح مجھے مت دیکھو۔ کہو چپ رہو گے کہ نہیں۔"

میں نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا تو اس نے پٹّی کھول کر میرے مُنہ سے رومال نکال دیا۔ زبان کانٹے کی طرح خشک ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھا کر بٹھا دیا۔ اور پھر بولا۔

"میں تمہارے لیے دودھ لایا ہوں۔ لو ناشتہ کر لو۔ اس میں مَیں نے اپنی گرہ سے تمہارے لیے اوولٹین منگوا کر ڈالی ہے کہ تمہیں کُچھ سہارا ہو جائے۔ کل دوپہر کے بعد تُم نے کچھ نہیں کھایا۔" اس کی آواز میں اس وقت بڑی ہمدردی جھلکتی تھی۔

"میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔" میں نے نفرت سے کہا۔

"مجھے تم سے بڑی ہمدردی ہے۔" وہ بولا۔

”خاک ہمدردی ہے تمہیں، تم ہی نے تو مجھے اُس رومال سے بے ہوش کیا تھا۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ وہ شخص بڑا مکّار معلوم ہوتا تھا اُس کی آواز بُہت میٹھی تھی۔

”اپنی جان بچانے کے لیے ہمیں یہ کام کرنا پڑا بیٹے۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو تم ہمارے دوست کو پہچان کر پکڑوا دیتے۔“ وہ بولا۔

”مگر تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ میں تمہیں پکڑوا سکتا ہوں۔“ میں نے پوچھا۔

”صُبح تھانیدار کے سامنے تم نے جو باتیں کہی تھیں اس سے ہم سمجھ گئے تھے کہ تم بہت خطرناک لڑکے ہو۔ اور تم اُس آدمی کو پہچان بھی لوگے جسے کل رات تُم نے اس گلی میں دیکھا تھا۔“ وہ بولا۔

”وہ کون آدمی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو ہم نہیں بتا سکتے، ہاں، تم کو اپنی جان پیاری ہو تو اُس واقعے کو بھول جاؤ، اور اگر وہ آدمی بھی تمہارے سامنے آجائے تو ماننے سے انکار کردو۔“ وہ بولا۔

”مگر میں ایسا کیوں کروں تم لوگوں نے میرے ساتھ کون سا نیک سلوک کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

وہ مجھے دیکھ کر بڑے دوستانہ انداز سے مسکرا رہا تھا۔ وہ بولا۔

"تمہیں ہم سے کوئی شکایت نہ رہے گی۔ ہمارے سلوک سے تم خوش ہو جاؤ گے۔ اب تم دودھ پی لو۔ میرا کہا مانتے جاؤ گے تو تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ ورنہ جانتے ہو ہم کون ہیں۔ خون خرابہ تو ہماری عادت ہے۔" اس نے چاقو کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"اچھا، تو یہ بات ہے، پھر میرے ہاتھ ہی کھول دو۔" میں نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ میں ابھی نہیں کھول سکتا۔ جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ تم ہمارا کہنا ماننے پر صدقِ دل سے تیّار ہو تب ہم تمہاری ساری رسّیاں کھول دیں گے۔" وہ بولا۔

"خُدا کی قسم میں تم لوگوں کا کبھی ساتھ نہیں دوں گا۔ آج نہیں تو کل میں ساری باتیں تھانیدار کو بتا دوں گا۔ پہلے تو میں ایک آدمی کو پہچانتا تھا اب تین آدمیوں کو پہچان سکتا ہوں۔ تمہیں بھی اور اس تمہارے ساتھی کو بھی جو سپاہی بن کر میرے گھر گیا تھا اور اس مونچھ والے کو بھی جس کے رخسار پر انچ بھر لمبا زخم ہے۔" میں نے تیز ہو کر کہا۔

میری باتیں سن کر وہ پر بوکھلا کر بولا:

"یہ ٹھیک ہے کہ اب تم تینوں آدمیوں کو پہچان سکتے ہو مگر وہ بُہت ظالم ہیں، وہ تمہیں یہیں ختم کر دیں گے۔ تمہاری یہ ضد رنگ لا کر رہے گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم اپنا فیصلہ بدل دو، ورنہ وہ تم پر بہت سختی کریں گے۔"

"مگر میں اب کیا کر سکتا ہوں، اب تو میں تم لوگوں کی قید میں ہوں۔" میں نے کہا ۔"اس قید سے میں تمہیں رہائی دلا سکتا ہوں مگر صرف اس شرط پر کہ تم اپنا منہ نہیں کھولو گے۔ ہماری جگہ تم کسی اور آدمی کو پکڑا دو۔ اس کے بدلے میں ہم تمہارے ساتھ ایسا سلوک کریں گئے کہ تم خوش ہو جاؤ گئے۔ اب تم دودھ پی لو اور دوپہر تک غور کر لو میں پھر آؤں گا۔" یہ کہہ کر اُس نے دودھ کا بھوا ہوا لمبا گلاس مجھے دے دیا۔ اس میں واقعی اوولٹین پڑی ہوئی تھی اور دودھ بہت ہی مزے دار تھا۔

دودھ پی کر میں نے گلاس اس کے حوالے کر دیا۔ وہ جانے لگا تو میں نے پھر کہا۔

"میرے ہاتھ تو کھولتے جاؤ۔"

”نہیں میں تمہارے ہاتھ ابھی نہیں کھولوں گا۔ اُٹھو میں تمہیں پلنگ پر ڈال دیتا ہوں۔ لحاف اوڑھ کر سو رہو۔ اور فکر مت کرو ہم نے تمہاری امّی جان کے پاس پیغام بھجوا دیا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے مضبوط بازوؤں میں بھر کر اُٹھایا اور لے جا کر پلنگ پر ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے لحاف کھول کر مجھ پر دے دیا اور خود باہر سے دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

لحاف اوڑھ کر لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور میں جلد ہی سو گیا۔

جب میں جاگا تو دوپہر ہو چکی تھی اور میری آنتیں قُل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ اب میں چاہتا تو انہیں بلند آواز سے پکار سکتا تھا مگر میں کس کا نام لیتا۔ میرے ہاتھ مضبوط ریشمی ڈوریوں سے بندھے تھے۔ ہزار کوشش کے باوجود میں یہ ڈوریاں نہ کھول سکا۔ بھُوک سے میری آنتوں میں اینٹھن ہو رہی تھی۔

نیند سے بیدار ہوئے مجھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ دروازہ کھُلا اور وُہی ٹھگنا اندر آتا۔ اس نے اندر آ کر آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ اس کے ہاتھ میں ڈھنپی ہوئی ایک ٹرے تھی۔ وہ مجھے جاگتا دیکھ کر بولا۔

”لو کھانا کھا لو، میں دو دفعہ آ چکا ہوں۔ تُم سوئے ہوئے تھے۔ اب تیسری بار سالن گرم کر کے لایا ہوں۔ فضلی کو بھی تمہاری بڑی فکر ہے۔ بار بار مجھے کہتا ہے جا عیدے اُسے کھانا دے آ، جا عیدے کھانا لے جا۔“

”یہ فضلی کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بھی ہمارا ایک پرانا یار ہے۔“

”یہ وہی تو نہیں جو سپاہی بن کر ہمارے گھر گیا تھا۔“

”فضول باتیں نہ کرو، لو کھانا کھالو۔“

”عیدے صاحب میں کھانا کس طرح کھا سکتا ہوں۔“ میں نے اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یار میں تمہارا ایک ہاتھ کھول دیتا ہوں۔ مگر خبردار کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا ورنہ پیٹ پھاڑ دوں گا۔ بارہ آدمی قتل کر چکا ہوں۔ تمہارے سمیت ساڑھے بارہ ہو جائیں گے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”تم مجھے آدھا آدمی سمجھتے ہو۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ اُس کی باتیں بڑی دلچسپ تھیں۔ لہجہ تو اتنا میٹھا تھا کہ بس اس کی باتیں سنتے جاؤ۔ مگر دیکھنے ہیں وہ بھیڑیے کی

طرح خوفناک نظر آتا تھا۔ آدھا سر گنجا تھا اس کا ایک نتھنا ذرا اپھٹا ہوا تھا اور مُنہ پر چیچک کے داغ تھے۔ رنگ اس کا سیاہی مائل تھا۔ اور ہونٹ موٹے تھے۔ ہاتھ پاؤں کا اتنا مضبوط تھا کہ جہاں میرے بدن پر انگلی رکھتا تھا وہیں جلد پیلی ہو جاتی تھی۔ اس کی سیاہ چمکیلی آنکھیں دیکھ کر خوف آتا تھا۔ اُس کی عُمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اب تک شاید اپنی زندگی میں اس نے گناہ کے سوا اور کچھ نہ کیا تھا۔ اس نے چاقو نکال کر کھول لیا اور اپنے دانتوں میں اس کا پھل دبا کر ہاتھوں سے ریشمی ڈوری کھولنے لگا۔

"یہ تُم میرے سامنے آکر چاقو کیوں کھول لیتے ہو۔"

"یہ چاقو تو میرا زیور ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ڈوری ڈھیلی کر کے میرا دایاں ہاتھ آزاد کر دیا اور پھر میرا بایاں ہاتھ اُس کے بعد میرے دونوں پاؤں رسّی سے جکڑنے لگا۔ یکایک میرے دل میں یہاں سے بھاگ نکلنے کا جذبہ جوش مارنے لگا۔ میرے دماغ میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگے اور پھر بجلی کی تیزی کے ساتھ میرا دایاں ہاتھ اُس کے چاقو کے دستے پر جا پڑا جو اس کے دانتوں میں پھنسا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے چاقو اس کے منہ سے کھینچ لیا۔ دودھاری چاقو جب اس

کے دانتوں تلے سے کرچ کر کے باہر نکلا تو دائیں بائیں ہونٹوں کے کنارے آدھ آدھ انچ کٹ گئے۔ پھُرتی سے میں نے اپنا دوسرا ہاتھ بھی آزاد کر لیا۔ ایک لحظے کے ہزارویں حصّے میں یہ سب ہو گیا۔ اس کے مُنہ سے خون کا فوّارہ چھُوٹ رہا تھا، وہ ہلکی سی چیخ مار کر ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

وہ غصّے سے ایک دم پاگل ہو گیا تھا اور اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اچانک یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ اب وُہ بول بھی نہ سکتا تھا۔ ملیشیے کی قمیص خون سے تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ پیچھے ہٹتا ہوا میز کے قریب جا پہنچا۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر ٹکی تھیں۔ عمر میں بڑا فرق تھا، لیکن میرا قد اس کے برابر تھا۔ اس کا بدن گھٹا اور ورزشی تھا اور میں نے سکول میں صرف ہاکی کھیلی تھی۔ اس کی گرفت آہنی تھی مگر اُس کے جبڑے کٹ چکے تھے۔ اس نے ٹٹول ٹٹول کر میز پر پڑے ہوئے پھولدان کو پکڑا اور پوری قوّت سے میری طرف پھینکا۔ مگر میں نے بائیں ہاتھ سے اُٹھا کر لحاف آگے کر دیا۔ روئی سے تانبے کا وزنی پھولدان ٹکرا کر نیچے گر گیا اور میں محفوظ رہا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ اس کی جان سخت خطرے میں ہے۔



وہی چاقو جو اس کا زیور تھا اب میرے ہاتھ میں آ چکا تھا اور میں نے اس ریشمی ڈوری سے اپنے پاؤں کو آزاد کر لیا تھا۔

”اگر تم نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو۔۔۔۔۔“

جملہ پورا ہونے سے پہلے وہ یکایک مجھ پر پل پڑا۔ میری آواز نے اسے دلیر بنا دیا۔ میرے اچانک حملے سے بوکھلا گیا تھا۔ وہ یہ بھُول گیا تھا کہ ایک نوعمر لڑکا اس کے سامنے ہے۔ وہ مجھے کوئی قوی ہیکل دشمن سمجھ رہا تھا۔ مگر جب اس نے میری آواز سنی تو اس کی ساری کھوئی ہوئی جرأت واپس آگئی اور وہ مجھ پر زخمی چیتے کی طرح حملہ آور ہوا۔ میں اپنی پوری قوّت کے ساتھ چاقو سے وار کرنے لگا، مگر اُس نے میری کلائی پکڑ لی۔ اور پھر وہ کلائی چھڑائے نہ چھُٹی۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ میرا ہاتھ جو مروڑا تو چاقو گر کر دور جا پڑا۔

اس کے بعد وہ مجھے لاتوں اور گھونسوں سے یوں دھننے لگا جیسے میں انسان نہیں روئی کا گٹھا تھا۔ میری فلک شگاف چیخیں اسی کمرے میں گونجنے لگیں۔ میری چیخ و پکار شاید کمرے سے باہر بھی پہنچ رہی تھی، جس کے نتیجے میں دروازہ کھُلا اور ایک عورت اور مرد دوڑتے ہوتے اندر آئے۔ میرے خون کی گردش تیز ہونے لگی۔

دوسرا آدمی وہی تھا جسے میں نے گلی حکیماں میں رات کو کھڑے دیکھا تھا اور اب تک ہزار کوشش کے باوجود یاد نہیں کر سکا تھا کہ اس کی صورت مجھے آشنا کیوں معلوم ہوتی تھی۔

"کیا کرتا ہے عیدے۔ خُدا کے لیے ہاتھ روک لے۔" وہ عورت چیختی ہوئی بولی۔

"اوہ! بھابھی پیچھے ہٹ جا، میں اس کی ہڈّیاں توڑ دوں گا!" اُس نے چیختے ہوئے کہا اور میری پسلی میں اتنی زور سے مُکّا مارا کہ میں اُلٹ کر پلنگ کے اُوپر جا گرا۔ وہ عورت میرے اور اس کے بیچ میں آ گئی۔

"اوئے عیدے! یہ تیرے ہونٹ، یہ خون، آخر یہ کیا تماشا ہے؟" دوسرا آدمی بولا۔

جونہی اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی میں نے آنسوؤں سے بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب میرا جینا ناممکن ہے۔ دوسرا آدمی وہی تھا جسے میں نے پچھلی رات گلی کے اس تاریک کونے میں کھڑا دیکھا تھا۔ اس کے رُخسار کی ہڈّی پر دو انچ بھر لمبا زخم تھا اور اس کی مونچھیں نقلی مونچھوں سے بھی زیادہ اکڑی ہوئی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس وقت وہ سیاہ

جوتے، سفید شلوار اور کالی سی خوبصورت اچکن میں ملبوس تھا۔ اور کوئی معزّز آدمی معلوم ہوتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اُسے تو میں نے پندرہ دن پہلے صدر بازار میں ایک حلوائی کی دکان پر دیکھا تھا۔ وہاں وہ کسی سے مذاق مذاق میں ہاتھاپائی کر رہا تھا کہ معاملہ بگڑ گیا اور اس نے دوسرے آدمی کو بڑی گندی گالیاں دی تھیں جب سے اس کا نقشہ میرے ذہن میں بیٹھا تھا۔

"یہ۔۔۔۔یہ۔۔۔میرا چاقو میرا دشمن ہو گیا بھابھی۔ یہ چاقو میں نے دانتوں میں پکڑ رکھا تھا کہ اس بدبخت نے جھٹکا دے کر یوں کھینچا کہ میرے دونوں ہونٹ دائیں بائیں سے کٹ گئے۔" اس کا دم پھُول گیا تھا اور مُنہ سے عجیب سی بھپ بھپ کی آواز آ رہی تھی۔ جیسے اس کے دانت ہی نکل گئے ہوں۔ ایک لحظے کے لیے رُک کر اس نے مجھے دیکھا اور پھر بولا۔

"اور میں اس بدبخت کے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ ہٹ جا بھابھی۔ قسم خدا کی میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہہ کر اس کے اندر کا وحشی پھر اُچھلا اور وہ چھلانگ لگا کر میرے سر پر آ پہنچا اور۔۔۔ اور اس نے اپنی بھابی کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ اس کا سر دیوار سے ٹکرا گیا اور وہ تیورا کر فرش پر گر پڑی۔

"اوئے عیدے! تیری یہ مجال!" دوسرے آدمی نے شیر کی طرح گرج کر عیدے کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر اُسے یوں زمین سے اُوپر اُٹھالیا جیسے کوئی ہلکی بوری کو اُچھال کر اُوپر لے جائے۔ گردن گھٹنے سے عیدے کی آنکھیں اُبل کر باہر آنے لگیں۔ چند لمحوں تک اُس نے عیدے کو اسی طرح بکرے کی کٹی ہوئی ران کی طرح ہوا میں لٹکائے رکھا اور پھر پوری قوّت سے زمین پر پٹخ دیا۔ پھر زمین سے میمنے کی طرح گریبان سے پکڑ کر اُٹھایا اور ایک زبردست گھونسہ اس کے لہولہان جبڑے پر مارا جس سے عیدا تیورا کر میز کی طرف کرسیوں کے بیچ میں جا گرا۔ اس کے بعد وُہ آدمی اس کی چھاتی پر چڑھ کر اسے بے تحاشا مارنے لگا۔ چند منٹ تک وہ عورت فرش پر پڑی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اُٹھی اور عیدے کی درگت بنتی دیکھ کر پکار اُٹھی۔

"چھوڑ دے شیدے۔ چھوڑ دے۔ یہ پاپی بے موت مر جائے گا۔ چھوڑ دے اسے، خُدا کے لیے اب بس کر، مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا۔ اُٹھ جا عیدے کیوں تو اپنی ہڈّیاں تڑوا رہا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے خاوند کو عیدے کی چھاتی پر سے

اُٹھایا جو اس عرصہ میں نیم بے ہوش ہو چکا تھا۔ ایک تو اس کا خون زیادہ بہہ گیا تھا پھر اوپر سے اس کی ٹھکائی ایسی ہوئی تھی کہ وہ بالکل ہی نڈھال ہو کر پڑا رہا۔

وہ شخص اس کے بعد میری طرف لپکا اور غضب ناک نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"لڑکے اگر تو نے یہاں سے اب ہلنے کی کوشش کی تو تیرا خون پی جاؤں گا۔ سمجھا۔ میں بار بار حکم نہیں دیا کرتا۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے یوں جھنجھوڑا کہ میرا جوڑ جوڑ ہِل گیا۔ میں سہم کر دُہرا ہو گیا تھا۔ پھر مجھے واپس پلنگ پر دھکیل کر باہر نکلا اور تین منٹ بعد انہی قدموں سے واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں مرہم پٹّی کا سامان تھا۔ اس نے پہلے تو عیدے کے کٹے ہوئے ہونٹوں پہ خون بند کرنے والی دوا لگائی، جس سے خون بند ہو گیا۔ زخم ایسی جگہ لگے تھے جہاں پٹّی نہ بندھ سکتی تھی مگر اُس دوا سے اُسے کافی فائدہ ہوا۔ پھر اس نے اپنی بیوی کے زخم کو صاف کر کے اس پر سفید پٹّی باندھ دی۔ اس کے بعد اس نے ان دونوں کو گرم دودھ پلایا جو شاید دوسرے کمرے میں چولھے پر ہی دھرا تھا کہ وہ فوراً ہی لے کر آ گیا۔

پھر اس کے بعد وہ بولا۔ ”زہرہ وہ رسّی لا۔ اِدھر میں اِس بدبخت کو پھر اُسی طرح جکڑ دوں گا۔“ وہ بولی۔ ”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم دونوں باہر جاؤ۔ میں خود اس سے نپٹ لوں گی۔ اس عیدے کو بھی اُٹھا۔ یہاں سے دیکھ تو کیسے مُردہ سا ہو کر لیٹا ہے۔“

”تم نہیں سمجھ سکتی ہو زہرہ۔ یہ بڑا خطرناک لڑکا ہے۔ دیکھا نہیں تم نے اس نے کس طرح عیدے کو لہولہان کر دیا ہے۔ خدا کی قسم اس کو باندھنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے پلنگ پر سے وہ ڈوری اُٹھائی اور میرے دونوں ہاتھ پاؤں پکڑنے لگا۔ میں نے اپنا آپ چھُڑانے کی کوشش کی تو تڑاخ سے ایک تھپڑ میرے میرے مُنہ پر رسید کیا۔ سارا کمرہ میری آنکھوں میں گھوم گیا اور میں چکرا کر ایک طرف لڑھک گیا۔ اس کے ہاتھوں میں عیدے سے بھی زیادہ قوّت تھی اور وہ چاہتا تو دیوار کو دھکا دے کر گِرا سکتا تھا۔ اس قدر شہ زور آدمی تھا وہ۔ اُس نے میرے ہاتھ پاؤں جکڑ دیے۔ اب کی بار اس نے میری گردن بھی ایک گرہ میں پھنسا دی اور میں بالکل دہرا ہو کر یوں ڈھیر سا بن گیا جیسے میں انسان نہیں کوئی سامان کی گٹھڑی ہوں۔ اس دھاندلی پر پہلی بار میری

آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں چیخا چلّایا نہیں۔ میں بڑے صبر کے ساتھ آنسو بہاتا رہا۔ اس عورت نے بھی وہ آنسو دیکھے اور شیدے نے بھی۔ مگر شیدے کی نظر اُن آنسوؤں پر پڑی تو بولا۔

”بدبخت ٹسوے بہاتا ہے۔ اتنا خون میرے بھائی کا اگر کوئی اور بہاتا تو خدا کی قسم میں اس کے ہزار ٹکڑے کر دیتا۔ خدا کا شکر کر کہ تُو میرے ہاتھ سے بچ گیا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے عیدے تو کھڑا کیا اور آہستہ آہستہ اس کو کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ اب وہ عورت ہی اکیلی میرے کمرے میں موجود تھی۔ وہ چند لمحوں تک بڑے غور سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

”یونس تُو فکر نہ کر۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گی۔“ یہ کہہ کر وہ بھی باہر نکل گئی۔ دروازے کی چٹخنی اس نے باہر سے چڑھادی اور میں پھر اس کمرے میں اپنی قسمت پر آنسو بہانے کے لیے تنہا رہ گیا۔

میں پلنگ پر ادھ موا بندھا چھندا پڑا تھا۔ مجھے کسی چیز کی سُدھ بُدھ نہ تھی۔ بھُوک اور پیاس بھی رُخصت ہو چکی تھی۔ فرار کی کوشش میں ایسا خونی ہنگامہ گرم ہو چکا تھا کہ اب کسی نرمی کی کوئی اُمّید نہ تھی۔ جسم نڈھال اور زخموں سے چور تھا لیکن

دماغ میں طرح طرح کے خیال پیدا ہو رہے تھے۔ بڑی دیر کے بعد دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز آئی۔ پھر کسی نے دروازہ کھول دیا۔ اب میں اس قابل بھی رہا تھا کہ دروازے کی طرف نگاہ کر کے ہی دیکھ سکتا۔ میرا منہ دوسری طرف تھا اور کچھ اس طرح گردن جکڑی ہوئی تھی کہ سر کو جُنبش نہ دے سکتا تھا۔

"اوہ تم ابھی تک اسی حالت میں پڑے ہو۔ ہائے ہائے شیدے کا بیڑا غرق اس نے لڑکے کو کتنی بے رحمی سے جکڑ بند مارے ہوئے ہیں۔" میرے کانوں میں اس عورت کی آواز آئی۔ اس نے آگے بڑھ کر میری گردن کی گرہ ڈھیلی کر کے میرا سر تکیے پر رکھ دیا۔ میں اب بُجھی بُجھی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ میرے بدن کی طاقت سلب ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر دوڑتی ہوئی باہر چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں دودھ سے لبالب بھرا شیشے کا گلاس تھا۔ اس نے میرے قریب بیٹھ کر مجھے سہارا دے کر اُٹھایا اور میرے لبوں سے وہ گلاس لگا کر بولی۔

"لے یہ دودھ پی لے میرا ویر۔ تو نے صُبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

جی تو نہ چاہتا تھا مگر پھر بھی میں اس دودھ کو غٹا غٹ پینے لگا۔ بھوک کِتنی بُری بلا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اس روز ہوا۔ جب میں وہ دودھ پی چکا تو وہ بولی۔

”یونس اگر تو چاہے تو میں تمہیں ایک شرط پر یہاں سے رہائی دِلوا سکتی ہوں۔“

اگر وہ دودھ پلائے بغیر مجھ سے یہ بات کہتی تو میں فوراً کہہ دیتا کہ مجھے اس کی ہر شرط منظور ہے۔ مگر اب میرے بدن میں پوری طاقت عود کر آئی تھی۔ اور میں نئے سرے سے سارے معاملے پر غور کرنے کے قابل تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔

”آپ کو میرے جیسے کمزور سے لڑکے کے سامنے شرط پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ جو چاہیں مجھ سے زبردستی منوا سکتی ہیں۔“

میری یہ بات سن کر بڑی عجیب سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر اُبھری اور وہ بولی۔

”تو بڑا سمجھ دار لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ مگر ہر معاملے ہیں ضد اچھی نہیں ہوتی۔ اس حکیم سے ہماری بُہت پُرانی دشمنی ہے۔ اس کے لڑکے کاروبار میں میرے خاوند کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔ پھر ایک زمین کے معاملے میں بھی ہمارا اس سے بُہت پُرانا جھگڑا ہے۔ اس سے تمہیں کوئی ہمدردی تو نہیں ہے نا۔“

”نہیں مجھے اس سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا تو سمجھتا ہے کہ جس آدمی کو تو نے وہاں گلی میں دیکھا تھا اُسے گرفتار کروانا تیرا فرض ہے۔“ ”فرض تو ہے؟“ میں نے کہا اور پھر ہنستے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس معاملے میں ضد نہیں کروں گا۔“

”تو اگر ہم تمہیں چھوڑ دیں تو تم گھر جا کر اس معاملے کی ساری تفصیل اپنے گھر والوں کو اور پولس کو بتا دو گے۔“

اب کے میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”اگر میں چاہوں، تمہاری بڑی بہن چاہے، وہ بہن جو تمہاری جان بچانے کے لیے سر پھڑوا بیٹھی ہے، کہ اس گھر کے متعلق کوئی بات کسی کو بھی نہ بتائے تو کیا تم اپنی اس بہن کی یہ خواہش ٹھکرا دو گے۔“

”مگر۔۔۔ مگر۔۔۔۔ باجی۔۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ میں نے پہلی بار اسے باجی کہا تو عجیب سا معلوم ہوا۔

”آپ ایسا کیوں چاہتی ہیں؟“

”کیونکہ اسی میں ہمارا بھلا ہے۔“

”مگر میرا تو اس میں کوئی فائدہ نہیں۔“

”تمہارا بھی اس میں فائدہ ہو سکتا ہے، مگر تُم پہلے یہ وعدہ کرو کہ تم نے جو کچھ یہاں دیکھا ہے اس کا کسی سے ذکر نہیں کرو گے۔ ایک بہن کی خاطر تم اتنا بھی نہیں کر سکتے۔“

”میں آپ کے لیے اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں، مگر پولیس بھی تو میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ وہ ضرور یہ پوچھیں گے کہ تم نے اتنا وقت کہاں گزارا۔“ میں نے سوچ سوچ کر کہا۔

”اس کا سیدھا جواب تمہارے پاس یہ ہو گا کہ کوئی شخص تمہیں بے ہوش کرنے کے بعد اغوا کر کے لے گیا تھا۔“ وہ بولی۔

”پھر وہ پوچھیں گے کہ وہ تمہیں کہاں لے گیا تھا اور تم بچ کر کس طرح آ گئے۔“

”تو تم کہہ سکتے ہو کہ وہ مجھ سے طرح طرح کے سوال پوچھنے کے بعد میری آنکھوں پر پٹّی باندھ کر مجھے پھر میرے گھر چھوڑ گئے تھے۔“

”مگر وہ کس قسم کے سوال ہوں گے۔“

"اسی چوری کے متعلق کہ تم نے وہاں کس آدمی کو دیکھا۔ اسے پہچانتے ہو یا نہیں۔ اس کا حلیہ کیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔" "آپ ہی بہتر سمجھ سکتی ہیں۔ میں تو شاید اس امتحان میں پورا نہ اُتروں، جھوٹ کہیں نہ کہیں تو ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"اچھا تو پھر تم صرف اتنا ہی کہہ دینا کہ تم جب سپاہی کے پیچھے پیچھے چلنے لگے تو اچانک تھانے اور پولس کے خوف سے بھاگ نکلے کہ خُدا جانے اس معاملے میں تمہیں کِس چکر میں پھنسا دیں۔" وہ سوچ سوچ کر بولی۔

"ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔ میں کہہ دوں گا کہ میں پولس کی پوچھ گچھ سے گھبرا کے شہر سے باہر جنگل میں جا چھُپا تھا۔ آج ذرا خوف ذائل ہوا ہے تو واپس آ گیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"شاباش یہی بات تو میں تم سے چاہتی تھی۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہاری ماں سے بھی مل آئی ہوں۔ شیدا میرے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر گیا تھا۔ میں اُسے پانچ ہزار روپیہ دے آئی ہوں اور سمجھا آئی ہوں کہ یونس کو اس جھگڑے سے الگ کر دو، ورنہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ اس نے وعدہ بھی کر لیا ہے۔ اب میں

تمھیں واپس بھیج دوں گی۔ میں تمھیں یہ دو فوٹو دے رہی ہوں۔ اگر تھانے میں پولس پھر تم سے چور کو پہچاننے کے لیے کہے تو جن دو آدمیوں کی یہ تصویریں ہیں اُن میں سے کسی ایک پر انگلی رکھ دینا۔ کیونکر تمہاری شہادت پر ہی اس معاملے کا سارا دار و مدار ہو گا۔ تمہاری ماں کو بھی میں یہ بات سمجھا آئی ہوں کہ اگر یونس نے ہمارا ساتھ نہ دیا تو اس کی خیریت نہ سمجھو۔ اب تُو خود بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ سارا معاملہ کس قدر اہم ہے۔ اب صرف ہماری ہی نہیں تمہاری ماں کی بھی عزّت کا سوال ہے۔ وہ ہم سے وعدہ کر چکی ہے۔ ہم دراصل اپنے ان دشمنوں کو جیل بھجوانا چاہتے ہیں۔ اگر وہ پکڑے جائیں تو ہم کچھ مال ان کے گھر سے بر آمد کروادیں گے۔ یہ بات کچھ بھی مشکل نہ ہو گی۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم شناخت میں اس چور کی جگہ ان دو آدمیوں میں سے کسی پر انگلی رکھ دو۔"

"مُجھے یہ شرط منظور ہے باجی۔ یہ تو کوئی ایسا مشکل کام نہ ہو گا۔ میں بڑی آسانی سے اِن دو آدمیوں میں سے کسی ایک پر انگلی رکھ دوں گا۔"

میں نے دونوں تصویروں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”شاباش میرا ویر! یہی میں چاہتی تھی۔ بس رات کو نو بجے تم گھر پہنچ جاؤ گے۔ بے فکر رہو۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے میرے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔ پھر بولی۔

”لو میں اب تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ دروازہ باہر سے بند کر کے چلی گئی۔ جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کھانے کی چیزوں سے لدا پھندا ایک بڑا سا ٹرے تھا جس میں پھل بھی تھے اور روٹیاں بھی سالن بھی تھا اور کباب بھی۔ وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور نوالے توڑ توڑ کر مجھے کھلانے لگی۔ اس کھانے کا جو لطف آیا وہ میں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ بس وہ کھلاتی رہی اور میں دل کھول کر کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ میں سیر ہو گیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے ہاتھ منہ دھویا اور مطمئن ہو کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ برتن سمیٹتی ہوئی بولی۔ ”لو اب تم ذرا دیر کے لیے آرام کرو۔ عیدا تم سے لڑنے کے بعد اپنے کمرے میں جا کر سو گیا تھا۔ وہ سویا ہی رہے تو اچھا ہے، سخت احمق آدمی ثابت ہوا ہے۔ آدھے آدمی سے مار کھا گیا۔ میں رات کو نُو بجے دروازہ کھولوں گی۔ ٹھیک ہے نا۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔۔۔“میں نے کہا اور وُہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس نے دروازے سے نکل کر باہر کی چٹخنی چڑھادی۔ اب میں پھر اُس کمرے میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک کھڑکی تھی جس میں سلاخیں لگی ہوتی تھیں۔ میں اپنی مرضی اور کوشش سے آزاد نہ ہو سکتا تھا۔

اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے اور میں ابھی تک اس فکر میں ڈوبا ہوا تھا کہ جو کچھ وہ عورت چاہتی تھی کیا وہ سب میں کر سکوں گا۔ میری سمجھ میں تو وہ گورکھ دھندا بالکل نہ آتا تھا۔ اور یہ بات تو ظاہر تھی کہ وہ لوگ کسی بے گناہ کو پھنسانا چاہتے تھے مگر میں اُن کا آلہ کار کیوں بنوں۔ وہ میری ماں کو پانچ ہزار روپیہ کیوں دے آئی تھی اور امّی جان نے لے کیوں لیا تھا۔ اُنہوں نے اس عورت سے انٹ شنٹ وعدے کیوں کیے تھے۔ میں سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر ان لوگوں نے اس مکان سے نکال کر پھر میری آنکھوں پر پٹّی باندھ دی تو پھر میں کس طرح معلوم کر سکوں گا کہ میں کہاں قید تھا اور ان لوگوں کو کہاں ڈھونڈھا جا سکتا ہے۔ مجھے اس مکان کا صحیح محلِّ وقوع معلوم ہونا چاہیے۔ مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ وہ پھر میری آنکھوں پر پٹّی باندھ دیں گے اس مشکل کا کوئی

حل تلاش کرنا چاہیے۔ آخر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ مجھے کوئی رقعہ لکھ کر اس ٹیکسی یا ٹانگے میں پھینک دینا چاہیے۔ اگر میری قسمت اچھی ہوتی تو وہ لوگ میرا رُقعہ پڑھ کر ضرور میری مدد کریں گے۔ اس مقصد کے لیے میں فوری کمرے میں کاغذ تلاش کرنے لگا۔ میز کی دراز میں مجھے کسی بچّے کی کاپی مل گئی۔ وہیں ایک پنسل کا ٹکڑا بھی پڑا تھا۔ میری تو عید ہو گئی۔ میں فوراً میز پر بیٹھ کر لکھنے لگا۔

جنابِ من!

آپ جس مکان سے مجھے سوار کر کے لائے ہیں اس مکان کا پتا پُرانی کوتوالی کے تھانیدار کو بتا دیں۔ میری آنکھوں پر ان لوگوں نے پٹّی باندھ رکھی ہے جن میں سے ایک کا نام عیدا ہے اور دوسرے کا شیدا۔ میرا نام یونس ہے اور مجھے عیدے اور شیدے نے اغوا کر لیا ہے۔ وہ میرے ہاتھ پاؤں باندھے رکھتے ہیں اور میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیتے ہیں جس کی وجہ سے نہ میں بول سکتا ہوں نہ حرکت کر سکتا ہوں، نہ مجھے پر کچھ دیکھنے دیتے ہیں۔ میں ان کا قیدی ہوں۔ آپ براہِ کرم

مجھ پر اتنا احسان کریں کہ میرا یہ رقعہ تھانیدار صاحب تک پہنچا دیں۔ خُدا آپ کا بھلا کرے۔

مظلُوم

محمد یونس

یہ رقعہ لکھ کر میں نے تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا۔ اور نو بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب دروازہ کھلا اور شیدا، وہی ہیبت ناک شیدا، اندر داخل ہوا۔

”ہوں تو اس بے وقوف عورت نے تیرے ہاتھ پاؤں بھی کھول دیے ہیں۔ چل بے اُٹھ۔ میں تجھے ایک منٹ کے لیے بھی کھلا نہیں دیکھ سکتا۔“

یہ کہہ کر اس نے جیب سے وہی ریشمی ڈوری نکالی جسے کھول کر وہ عورت لے گئی تھی۔ اس نے کَس کر میرے دونوں ہاتھ میری کمر کے پیچھے باندھ دیے۔ اس کے بعد اس نے زبردستی میرے مُنہ میں اپنا رومال ٹھونس کر میرا منہ ایک بڑے سے صافے کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر اس نے مجھے اپنی ٹانگوں میں دبا کر میری آنکھوں پر بھی پٹّی باندھ دی۔ وہ بدبخت اس قدر مضبوط تھا کہ اس نے مجھے چند

منٹوں میں توڑ مروڑ کر رکھ دیا۔ میں نے مزاحمت تو کی مگر اس کے سامنے میری کوئی پیش نہ چل سکی۔ بس اس کو دیکھتے ہی میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اس کی وہ خوفناک مونچھیں، وہ سُرخ چڑھی ہوئی آنکھیں اور پہاڑ جتنا اونچا لمبا قد دیکھ کر میرے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔

مجھے پوری طرح بے بس کرنے کے بعد اس نے مجھ پر کمبل اوڑھا دیا جو اس نے شاید الماری میں رکھا ہوا تھا۔ الماری کا قفل اس نے میرے سامنے کھولا کیونکہ اب صرف آواز سے ہی میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ دوسرا کیا کر رہا ہے۔

"چلو میرے ساتھ۔ میں تمہیں اب تمہاری ماں کے پاس لے جا رہا ہوں۔ مگر یاد رکھو! اگر تم نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا اور جو کچھ زُہرہ تمہیں سمجھا چکی، اگر اس پر عمل نہ کیا تو میں تمہارا خُون پی لوں گا۔ دیکھوں گا تم کس طرح میرے ہاتھ سے بچ سکتے ہو۔" یہ بات اس نے کچھ اتنے خوف ناک لہجے میں کہی کہ ایک بار تو میں سُن ہو کر رہ گیا۔

وہ دھکیلتا ہوا مجھے کمرے سے باہر لے چلا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں ہو تا تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں اور کون میرے ساتھ چل رہا ہے۔ البتّہ جب ہم ٹیکسی میں

بیٹھے تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے بائیں طرف ایک عورت ہے۔ وہ بالکل خاموش تھی اور انہوں نے کمبل سے میرا منہ سر پوری طرح لپیٹ رکھا تھا۔ ڈرائیور کو کیا معلوم کہ اس کی ٹیکسی میں کس قسم کی سواریاں بیٹھی ہیں۔ میرے ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے مگر انگلیاں تو آزاد تھیں۔ میں نے اپنے پہلو کی جیب میں دو انگلیاں ڈال کر رقعہ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اب میں کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا جب کہ میں اس رقعے کو ٹیکسی کے اندر کسی ایسی جگہ پھینک سکتا جہاں سے وہ اسے نظر بھی آ سکتا۔

ہم کافی دیر تک چلتے رہے، جب کار رُکی تو میں جس کونے میں بیٹھا تھا اس طرف کا دروازہ کھُلا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ دونوں جو میرے ساتھ آئے تھے اُتر کر اس دروازے کے سامنے کھڑے ہیں۔ ڈرائیور ابھی تک اپنی سیٹ پر ہی بیٹھا تھا۔ جب آنکھیں کام نہیں کرتیں تو حواس پوری طرح بیدار ہو جاتے ہیں۔ میرا بھی وہی حال تھا۔ میں سب کچھ سونگھ کر، سُن کر، چھُو کر، محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے چُپکے سے وہ رقعہ گاڑی کی سیٹ پر ڈالا اور خود باہر نکل آیا۔ ابھی تک مُنہ سر کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ اور وہ عورت مُجھے بازو سے پکڑ کر چلنے لگی تھی۔ خدا جانے وہ کون

سی ویران جگہ تھی، کوئی آواز مجھے سُنائی نہ دیتی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ میری اپنی گلی میں بھی شام ہوتے ہی چپ چاپ ہو جاتی ہے۔ سردی کی وجہ سب لوگ مکانوں کے اندر گھس کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ میری ہی گلی ہو۔ چند لمحوں کے بعد اس عورت نے میری آنکھوں سے پٹّی کھول دی۔ پھر اس نے میرے منہ سے کپڑا اتار دیا۔ میرا حلق تو خشک ہو رہا تھا مگر پھر بھی میں نے منہ سے رومال نکلنے پر خُدا کا شکر ادا کیا۔ بے حد میلا رومال تھا۔ اتنا کہ مجھے سارا راستہ اُبکائیاں سی محسوس ہوتی رہیں۔ میں نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف غور سے دیکھا تو میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ وہ میری اپنی ہی گلی تھی اور میرا مکان چند ہی قدم دور تھا۔ ٹیکسی ابھی تک کُچھ فاصلے پر کھڑی تھی اس کے اندر بتّی جل رہی تھی جس کی روشنی میں وہ ڈرائیور مجھے کچھ پڑھتا نظر آیا شاید وہ رقعہ اس نے اُٹھالیا تھا۔

"یونس! اب تم اپنے گھر جاؤ۔ میں اس وقت تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی۔ بس جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر تمہیں عمل کرنا ہو گا ورنہ تمہارے لیے اچھا نہ ہو گا۔" وہ عورت بولی۔ اُس کے بعد شیدے نے میرے دونوں ہاتھ بھی کھول دیے اور میرے دونوں کندھے پکڑ کر مجھے ہلکا سا جھنجھوڑ کر بولا۔

”یاد رکھ ہونس! یہ موقع پھر تیرے ہاتھ نہیں آئے گا۔ زہرہ کے مشورے سے میں تُجھے گھر بھیج رہا ہوں اور تیری ماں جانتی ہے کہ ہم کتنے ظالم ہیں۔ اپنے دُشمن کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ سمجھا۔ اب تو سیدھا اپنے گھر چلا جا۔“

یہ کہہ کر وہ دونوں پھر کار کی طرف بڑھے۔ ڈرائیور نے انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر ایک دم وہ رقعہ لپیٹ لیا۔ میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ڈرائیور ضرور میری مدد کرے گا۔ اس نے میرا رقعہ پڑھ لیا تھا۔ جب تک وہ ٹیکسی میری نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی میں وہیں کھڑا رہا۔ میری امّی جان نے مجھے دروازے میں داخل ہوتے دیکھا تو دوڑ کر مُجھ سے دیوانہ وار لپٹ گئیں۔ باجی بھی لپکتی ہوئی آ گئی۔ وہ دونوں میرے واری صدقے ہوتی رہیں۔ پھر انہوں نے طرح طرح کے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ مجھ پر جو کچھ بیتی تھی وہ میں نے ان سے بے کم و کاست بیان کر دی۔ اس پر وہ بولیں۔

”زہرہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ خُدا اس کا بھلا کرے۔ اب ہمیں بھی اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے۔ وہ مجھے گھر کے اخراجات کے لیے پانچ ہزار روپیہ دے گی تھی۔ اس کے بدلے میں وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ شناخت پریڈ ہیں تم اُس کے خاوند کو

نہ پہچانو، بلکہ دوسرے آدمی پر انگلی رکھ دو۔ یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے۔ انہوں نے مجھے میرا بیٹا واپس کر دیا ہے۔ ہمیں ان سے اپنا وعدہ پورا کرنا پر چاہیے۔"

"آپ کمال کرتی ہیں امُی جان۔ ہم سچّائی کو چھوڑ کر جھُوٹ کیوں بولیں اور پھر آپ نے وہ پانچ ہزار روپیہ اُن سے کیوں لیا تھا۔ اُس کے بغیر بھی ہمارا گزارہ ہو سکتا تھا۔" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں ہو سکتا تھا گزارہ۔ تمہارے باپ نے یہاں خزانہ دبا رکھا ہے۔ خُدا نے اچانک اس رقم کا بندوبست کر دیا ہے تو اب تم اپنی بہن کی خوشی اور ماں کی خوشنودی کے لیے ذرا سا جھوٹ بھی نہیں بول سکتے۔" وُہ ناراض ہو کر بولیں۔

"مگر امّی جان میں کِسی بے گناہ کو کیوں پھنساؤں۔ اس عیدے شیدے نے خدا جانے کتنے گھر لوٹ لیے ہوں گے۔ اور پھر اب تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ امّی جان۔ ڈرائیور نے میرا رقعہ تھانیدار تک پہنچا دیا ہو گا۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔" امّی جان بولیں۔

”وہ بھی اب گواہ بن گیا ہے کہ کس طرح ان لوگوں نے مجھے رسّیوں میں جکڑ کر گاڑی میں ڈالا تھا۔“میں نے کہا۔

”یہ تم نے سخت حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ جبکہ زہرہ تمہیں بتا چکی تھی کہ تمہاری اس نصیبوں جلی ماں نے اس سے پانچ ہزار روپیہ لے کے کچھ وعدے بھی کر لیے ہیں۔“امّی جان بے حد پریشان ہو کر بولیں۔

”ہم وہ پانچ ہزار روپیہ اُنہیں واپس کر دیں گے۔ امّی جان ہمیں ایسے روپے کی ضرورت ہی نہیں ہے جس سے اصل مجرم بچ جائے اور بے گناہ مارا جائے۔“میں نے کہا۔ میں ایک دم اپنی عمر سے کہیں زیادہ آگے نکل گیا تھا۔ اور میری سمجھ بُوجھ ان دو دنوں میں اتنی بڑھ گئی تھی کہ امّی جان حیران پریشان نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔

”یہ دو ہی دن میں تُو کتنا بدل گیا ہے، یونس۔ یہ ساری باتیں تُجھے کِس نے اتنی جلدی سکھا دیں میرے بیٹے۔ خُدا تمہیں محفوظ رکھے۔“بہُت بعد میں انہوں نے مجھے بتایا کہ میری باتیں سُن کر وہ ڈر گئی تھیں اور انہیں یقین ہو چلا تھا کہ میری

زندگی کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ چراغ میں تیل جب ختم ہونے لگتا ہے تو اس کی لَو ایک دم بُہت تیز ہو جاتی ہے اور اس کی روشنی میں ہر چیز جگمگ لگتی ہے۔

"خُدا نے اب مجھے ہر بلا سے محفوظ کیا ہے امّاں! البتّہ عیدا شیدا اب محفوظ نہیں ہیں۔ تھانیدار تک میرا رقعہ پہنچ چکا ہو گا یا پہنچ جائے گا۔ اگر وہ صُبح تک نہ آیا تو میں خُود پُرانی کوتوالی چلا جاؤں گا۔"

"بیٹا وہ لوگ تیرے خُون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ انہوں نے کوئی قتل تو نہیں کیا، چوری کی ہے۔ سال دو سال کی سزا وہ بھگت لیں گے مگر پھر وہ تمہیں زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ اپنی اس بوڑھی ماں پر ترس کھا بیٹے اور مجھ سے پیسے لے کر آج رات کی گاڑی سے کراچی چلا جا۔ میں کہوں گی کہ یونس گھر نہیں پہنچا۔ گلی میں کسی نے تمہیں کِسی نے نہیں دیکھا۔ کِسی کو معلوم نہیں تم کہاں ہو۔ کراچی اپنے ابّا کے پاس تم بالکل محفوظ رہو گے۔ میں بھی مہینے دو مہینے بعد وہاں بچّوں کو لے کر آ جاؤں گی۔" امّی جان نے کہا۔

"آپ کمال کرتی ہیں امّی جان۔ چوری کوئی کرے۔ اور شہر سے بھاگیں ہم۔ وہ کیوں بھلا، کوئی کِسی کا دیا کھاتے ہیں ہم۔" میں نے حیران ہو کر کہا۔

”تو ابھی نا سمجھ ہے بیٹا۔ تُجھے نہیں معلوم کہ غنڈے کتنے خطرناک ہوتے ہیں۔ پانی کی طرح گلیوں میں خون بہاتے پھرتے ہیں اور کوئی اُن کو پکڑ نہیں سکتا۔“ امّی جان نے کہا۔ باجی حسبِ معمول خاموش بیٹھی تھی۔ وہ کبھی کسی معاملے میں کچھ نہیں بولتی۔ بس سُنا کرتی ہے۔ صُبح شام منہ بند کر کے کان کھول رکھتی ہے اور سُنتی رہتی ہے اور کُچھ نہیں کہتی۔

”اچھّا امّی جان جو کُچھ ہو گا صُبح دیکھا جائے گا۔ میں کراچی نہیں جا سکتا۔ یہ نہایت نامناسب بات ہو گی۔“

”بیٹا وہ بد معاش عورت مجھ سے پانچ ہزار روپے کی رسید بھی لکھوا کر لے گئ تھی اور کہتی کی کہ اگر میں نے رسید نہ لکھی تو وہ تمہیں واپس نہیں آنے دے گی۔ وہیں تمہارے دشمنوں کو ختم کر دے گی۔“ امّی جان نے رونا شروع کر دیا۔ ”کیا لکھا تھا آپ نے اس رسید پر؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ کیونکہ اب تک کسی نے اس رسید کا ذکر ہی نہ کیا تھا۔

”وہ بس سیدھی سی رسید تھی کہ میں نے پانچ ہزار روپیہ وصول کر لیا ہے۔ اس نے خود ہی پہلے سے اس کی عبارت لکھ رکھی تھی۔ میں نے دستخط کر دیے تھے۔“ امّی جان نے کہا۔ پھر خود ہی کچھ سوچ کر بولیں۔

”مگر بیٹا وہ کاغذ کافی بڑا تھا اور اس کے درمیان میں وہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا اس لیے خاموش ہو رہا۔ خدا جانے امّی پر اس عورت نے کیا جادو کر دیا تھا۔ بس وہ اُن کے خلاف کوئی بات برداشت نہ کرتی تھیں۔ وہ بار بار مجھے یہی کہتی تھیں کہ میں رات ایک بجے کی گاڑی سے کراچی روانہ ہو جاؤں مگر میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں جب تک تھانیدار سے نہ مِل لُوں کہیں نہیں جا سکتا۔ اس پر وہ مجھ سے سخت ناراض ہو گئیں۔ گئی رات تک ہم اس بحث میں اُلجھے رہے۔ آہستہ آہستہ باجی بھی امّی کی طرفداری کرنے لگیں اور وہ جو کبھی کسی معاملے میں نہیں بولتی تھی پانچ ہزار کی رقم بچانے کے لیے مجھے کراچی جانے کی تلقین کرنے لگی۔

ابھی کوئی فیصلہ نہ ہو پایا تھا وُہ مجھ پر حاوی ہوتی جا رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ عیدے شیدے کا خوف میرے دل و دماغ پر پوری طرح مسلط کر رہی تھیں۔

رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے کہ اچانک باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں سمجھا میرا رقعہ کام کر گیا ہے۔

جب میں نے دروازہ کھولا تو میرا اندازہ بالکل صحیح نِکلا۔ باہر پُرانی کوتوالی کا تھانیدار حشمت علی کھڑا تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔

"تمہارا رُقعہ پہنچ گیا تھا، میاں اور ہم چوروں کو گرفتار کر چُکے ہیں۔"

"سچ؟ تھانیدار صاحب خُدا اُن کا بیڑہ غرق کرے، انہوں نے تو میری امّی جان کو بھی سخت خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہ اُن کو پانچ ہزار روپیہ صرف اس لیے دے گئے ہیں کہ میں شناخت میں ان کی جگہ کسی اور پر انگلی رکھ دوں کہ وہ چُور ہے۔" میں نے جلدی جلدی کہا۔

"اچھا تو بات ہے۔ چلو اچھا ہے۔ تم وہ پانچ ہزار روپیہ اپنے پاس رکھو۔ کسی کو واپس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" تھانیدار نے کہا۔

"نہیں جناب ہم تو فوراً وہ اُن کو واپس کر دیں گے۔ خُدا جانے وہ روپیہ کس کا ہے اور کِس کو لُوٹ کر وہ کِس کا گھر بھر گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

”خیر یہ باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی، تم ذرا ساری تفصیل بتاؤ کہ معاملہ کیا ہوا تھا۔ اندر کوئی بیٹھنے کی جگہ ہے؟“ وہ تھانیدار بولا۔

”جی ہاں کیوں نہیں۔ ٹھہریے میں بیٹھک کھولتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اپنے تین سپاہیوں سمیت ہماری اس معمولی سی بیٹھک میں ٹوٹی پھُوٹی کرسیوں پر بیٹھ چکے تو میں نے ان کو تفصیل کے ساتھ ساری باتیں سُنائیں۔ وہ بے حد خوش ہوا۔ بولا۔

”یونس بیٹے! میں تمہاری جرأت اور حاضر دماغی کی داد دیتا ہوں۔ ان لوگوں نے تمہیں اغوا کر کے اور اپنی موت کا سامان کر لیا ہے۔ اپنی گلی میں وہ بڑے باعزّت لوگ سمجھے جاتے ہیں اور انہوں نے مشہور یہ کر رکھا ہے کہ ان کا کراچی میں درآمد بر آمد کا کاروبار ہے۔ مگر آج تک ہمیں بھی یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ وہ بُہت چالاک چور ہیں۔ وہ تو کئی سال سے یہ کاروبار کر رہے ہیں۔ خدا جانے کتنے گھر انہوں نے تباہ کر ڈالے ہیں۔ مگر اب ساری چوریوں کا بھید کھل جائے گا۔“

اس کے بعد اس نے میری امّی جان کو ساری باتیں سمجھائیں اور بتایا کہ مجرم پر پردہ ڈالنا بڑا جرم ہے اور یہ کہ ایسا کر کے وہ خود بھی بُہت بڑا جرم کر رہی تھیں۔

پانچ ہزار کی رقم کے متعلق یہ فیصلہ ہوا کہ وہ رقم سرکاری خزانے میں بطور امانت جمع کروادی جائے۔ جب ان کے مقدمے کا فیصلہ ہوا تو اس رقم کے متعلق بھی کوئی فیصلہ ہو جائے گا کیونکہ وہ رقم بھی اس سازش کا ایک حصّہ تھی۔ امّی جان کو اس رقم کے ہاتھ سے جانے کا افسوس تو بُہت ہوا مگر ان کی کوئی پیش نہ چل سکی۔

اُسی رات زہرہ کو بھی تھانیدار نے گرفتار کر لیا کہ وہ بھی مُجرموں کی معاون و مددگار تھی۔ عیدے شیدے کا تیسرا ساتھی فضلی بھی پکڑا گیا۔ کافی دن تک مقدمہ چلتا رہا۔ سارا مال بھی پولیس نے ان لوگوں سے برآمد کر لیا۔ مجھے اس مقدمے میں بڑی اہمیت حاصل رہی۔ میرے خُوب خُوب چرچے اخباروں میں ہوتے رہے۔ بالآخر مقدمے کا فیصلہ ہو گیا۔ عیدے شیدے اور فضلی کو سات سات سال قید بامشقّت کا حکم سنا دیا گیا۔ زہرہ کے ساتھ عورت ہونے کی وجہ یہ رعایت کی گئی کہ اسے صرف دو سال کی سزا دی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ وہ پانچ ہزار کی رقم محمد یونس ولد محمد یوسف کو سرکار کی طرف سے بطورِ انعام دی جائے۔ جس دِن وہ رقم مجھے ملی اس دن ہمارے گھر میں چراغاں کیا گیا تھا۔

خانہ بدوش

اسکول سے جب چھٹی ہوئی تو میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔ مجھے بڑے زور کی بھوک لگی تھی۔ صبح ناشتہ بھی ٹھیک سے نہ کر سکا تھا۔ اسکول سے دیر ہو رہی تھی۔ اس لیے لسّی کا ایک گلاس پی کے میں اسکول چلا گیا تھا۔ سارا دن پیٹ میں چوہے ناچتے رہے تھے۔ اس لیے میں دوڑتا ہوا گھر کی طرف چلا۔ جب میں ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو مجھے دو بوڑھی عورتیں مکان سے باہر آتی نظر آئیں۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے تھیلے تھے جیسے اکثر فقیر عورتوں کے پاس ہوتے ہیں مگر ان کا حلیہ فقیروں جیسا نہیں تھا۔ صاف سُتھرے سیاہ رنگ کے لمبے کرتے جو چغے معلوم ہوتے تھے وہ پہنے ہوئے تھیں۔ اور ان کے چہرے صاف سُتھرے چمکتے نظر آتے تھے۔ ان کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے ایک لحظے کے لیے ان کو غور سے دیکھا۔ ایک عورت کی ٹھوڑی پر بڑے گہرے زخم کا نشان تھا۔ دوسری عورت کا بایاں کان درمیان سے کٹا ہوا تھا۔ شاید وہ بھاری زیور

پہننے کی وجہ سے کٹ چکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ایک طرف ہو کر دروازے کی طرف لپکیں۔ میں سمجھا بھکارنیں ہیں جو آٹا مانگ کر چل دی ہیں۔ جب وہ باہر نکلیں تو میں دروازہ اندر سے بند کر کے ڈیوڑھی میں سے گزر کر صحن میں چلا گیا۔

"امّی جان! بڑی بھوک لگی ہے۔ پہلے ہمیں کھانا دیجیے۔" میں نے بلند آواز سے کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت اندر کمرے میں پنکھے کے نیچے لیٹی ہوں گی۔ میں نے بستہ تخت پوش پر پھینکا اور کمرے میں جا گھسا مگر امّی جان کہیں نظر نہ آئیں دالان بھی خالی تھا۔ وہ بیٹھک میں بھی موجود نہ تھیں۔ میں ان کی تلاش میں پاخانے کی طرف گیا۔

"امّی جان!" میں بلند آواز سے پکارا مگر مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ "کیا مُصیبت ہے۔ یہ آج امّی جان کہاں چلی گئی ہیں۔" میں نے سوچا اور چھت پر جا چڑھا۔ وہاں چوبارہ بھی خالی پڑا تھا۔ میں گھبرا کر پھر نیچے اُتر آیا اور دالان میں سے گزر کر کوٹھڑی کی طرف بڑھا اور یہ دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا کہ امّی جان وہاں فرش پر بے ہوش پڑی ہوئی تھیں اور تمام صندوق کھلے پڑے تھے۔ سب

کپڑے اُلٹے سیدھے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ زیوروں کے ڈبّے بھی اِدھر اُدھر پڑے تھے اور وہ سب کے سب خالی تھے۔

”امّی جان!“ میں نے چلّا کر کہا اور ان سے لپٹ کر بے تحاشا رونے لگا۔ مگر میرے بار بار پکارنے کے باوجود وہ نہ بولیں۔ انہیں ہوش ہی کہاں تھا جو وہ میری بات کا جواب دیتیں۔ میں دوڑتا ہوا ہمسایوں کے گھر گیا اور وہاں سے ارشد کی امّی کو لے کر آیا۔ وہ بھی یہ سارا ماجرا دیکھ کر سخت حیران ہوئیں۔ اُنھوں نے امّی جان کو ہوش میں لانے کے کئی جتن کیے۔ کوئی آدھ گھنٹے کی سَر کھپائی کے بعد امّی جان کو ہوش آیا تو وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگیں اور جب زیوروں کے خالی ڈبّے اور کپڑوں کے بکھرے ہوئے انباروں پر اُن کی نظر پڑی تو چلّانے لگیں۔

”ہائے یہ میرے زیور کہاں گئے۔ یہ کپڑے کِس نے اِدھر اُدھر بکھرے ہیں۔ ہائے میں لُٹ گئی۔ وہ فقیرنیاں میرا سب کچھ لوٹ کر لے گئی ہیں۔“

”کون فقیرنیاں؟“ یہ تم کیا کہہ رہی ہو بہن؟“ ارشد کی امّی نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہائے میری قسمت پھُوٹ گئی، بہنا، وہ کلموہیاں مُجھے برباد کر گئی ہیں۔“ امّی جان نے سینہ کوٹتے ہوئے کہا۔

”مگر امّی جان یہ قصّہ کیا ہے۔ وہ فقیرنیوں کو تو میں نے ڈیوڑھی میں سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ اُن کو آپ نے اندر کیوں آنے دیا تھا؟“

”تم نے دیکھی تھیں وہ، بس بس وہی ڈاکہ ڈال کر گئی ہیں، بیٹا جاؤ پولیس کو بلاؤ۔ اُن کو پکڑو۔ اپنے ابّا کو اطلاع دو۔ ہم تو برباد ہو گئے۔ حیدر خدا کے لیے کچھ کرو۔“
”مگر ہوا کیا ہے۔ کچھ بتا بھی تو دیں کہ وہ کسی طرح آپ کے سامنے آپ کا گھر لوٹ کر لے گئیں۔“ ارشد کی امّی نے کہا۔ میں خود بے حد حیران تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔

”ہائے بہن کیا بتاؤں، وہ جادُو ٹونے کرتی پھرتی ہیں۔ وہ آئیں تو پہلے خیر مانگنے لگیں۔ پھر ان میں سے ایک بولی۔ بی بی اگر تو ہمیں شکر کا شربت پلائے تو ہم

تمھیں ایک بڑا برکت والا تعویذ دیں گی۔ میں نے کہا تعویذ کی کیا بات ہے تم شربت پینا چاہو تو پی لو۔ اس پر وہ صحن میں بیٹھ گئیں۔ میں نے ان کو اندر پنکھے کے نیچے بیٹھنے کے لیے کہا۔ انسان کو دوسرے انسان سے ہمدردی ہونی چاہیے۔ میں نے ان کو شکر کا شربت پلایا۔ پھر ان میں سے ایک بولی بی بی ایک ماچس کی تیلی اور پیالی بھر پانی ہمیں لا دو۔

میں نے دونوں چیزیں لا کر اسے دے دیں۔ اس پر دوسری نے سفید کاغذ مانگا میں نے وہ بھی ان کو دے دیا۔ پھر ان میں سے ایک جو زیادہ بوڑھی تھی اس سفید کاغذ پر تیلی پانی میں ڈبو کر کچھ لکھنے لگی۔ میں ان کی اس حرکت پر ہنستی رہی کہ بھلا پانی سے بھی کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتی رہی۔ یہاں تک کہ سارا کاغذ پانی کی لکیروں سے تر ہو گیا۔ وہ بولیں "لے بی بی اب تو ذرا دیر کے لیے اس کاغذ کو مُٹھّی میں رکھ کر اپنی تقدیر پڑھ لے۔ میں نے چند لمحوں تک وہ کاغذ اپنی مُٹھّی رکھ کر جب کھولا تو اُس پر سُرخ رنگ کی تحریر نمایاں ہو چکی تھی۔ میں نے اس کو پڑھا تو حیران رہ گئی۔ اس میں لکھا تھا کہ حیدر کے ابّا کی ترقّی ہونے والی ہے اور یہ کہ

میرے تین بھائیوں میں سے ایک بھائی کے لیے ولایت کا سفر بُہت مبارک رہے گا۔ یہ دونوں باتیں سچّی تھیں۔ حیدر کے ابّا کی کل ہی ترقّی ہونے والی ہے۔ وہ اب نائب تحصیلدار ہو جائیں گے اور میرے بھائی کے لیے جو لندن جا چُکا ہے ولایت کا سفر واقعی بُہت مبارک رہا ہے کیونکہ وہاں سے اس نے ہزاروں روپے گھر بھیجے ہیں۔ بس بہن تعویذ پر جس پر پانی سے اس عورت نے لکیریں کھینچی تھیں، یہ باتیں پڑھ کر میں تو ان کے فریب میں آ گئی۔ وہ بولیں بہن اگر تو چاہے تو ہم تمھیں روپے بھی دُگنے کر کے دے سکتی ہیں۔ مگر آج ہم صرف سو روپے تک کے نوٹ دُگنے کریں گی کیونکہ ہمارے مُرشد کا حکم ہے کہ منگل وار کو کسی شخص کی رقم سَو سے زیادہ دُگنی کرو گی تو خُود مُصیبت میں پھنس جاؤ گی، پھر ایک بولی گھر میں کتنی رقم ہو گی۔ اس وقت میں نے کہا چودہ سو روپیہ گھر میں رکھّا ہے۔ اس پر وہ بولی اچھا باقی تیرہ سو ہم جمعہ مبارک کو دن کے بارہ بجے آ کر دُگنا کر دیں گی۔ اس وقت تم صرف سَو روپے کا نوٹ لے آؤ۔ میں قسمت کی ماری تو پوری طرح ان کے چکّر میں پھنس چکی تھی۔ ہائے بہن میری عقل پر پردہ پڑ چکا تھا۔ میں نے ان کے سامنے اُس ٹرنک میں سے چودہ سو روپیہ نکال کر ایک سو کا نوٹ اُن کو دیا

جسے پڑھ کر کچھ دَم دُرود پڑھنے لگیں پھر اُن میں سے ایک نے مجھے وضو کرنے کے لیے کہا۔ میں پانی کے لیے غسل خانے کی طرف بڑھی تو ایک بولی پانی کا لوٹا بھر کر یہاں لے آؤ۔ ہم اس لوٹے پر دم کریں گی پھر تم اس دم کیے ہوئے پانی سے وضو کرو گی تو من کی مراد فوراً پوری ہو گی۔ میں لوٹا بھر کر پانی کا اُن کے پاس لے آئی جس کو پکڑ کر عورت نے چند منٹ تک مُنہ ہی مُنہ میں کوئی جنتر منتر پڑھا اور پھر اپنے تھیلے میں سے اس نے ایک فٹ لمبی خوشبودار لکڑی نکال کر پانی میں پھیری۔ وہ لکڑی کیا تھی کوئی مُشک نافہ تھی کہ اس کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک اُٹھا۔ پھر انہوں نے مجھے یہیں اس دالان میں وضو کرنے کے لیے کہا۔ میں وہ لوٹا لے کر وضو کرنے بیٹھ گئی۔ کاش میں اس پانی سے وضو نہ کرتی۔ جو نہی میں نے وہ پانی ناک میں ڈالا مجھ پر غشی طاری ہونے لگی اور پھر مجھے کسی بات کا ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں، جب میری آنکھ کھلی تو گھر کو اس حال میں پایا کہ میرا سب کُچھ لُٹ چکا تھا۔"

امّی جان نے رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ وہ چودہ سو روپیہ بھی غائب تھا، ٹرنکوں سے زیور بھی وہ عورتیں نکال کر لے گئی تھیں اور قیمتی کپڑے بھی۔ نقصان کا اندازہ چار ہزار روپے کے قریب تھا، اور میں حیران تھا کہ اب کیا ہو گا۔ اُن عورتوں کو پکڑنا کسی طرح ممکن نظر نہ آتا تھا۔ وہ تو ایسی وارداتوں کے بعد شہر ہی چھوڑ دیتی ہیں۔ میں بھاگا بھاگا ابّا جان کے دفتر پہنچا۔ انہوں نے جب سارا قصّہ سُنا تو ان کی بھی سِٹّی گُم ہو گئی۔ وہ اسی وقت گھر پہنچے۔ بیٹھے بٹھائے اتنی بڑی چوٹ سہنا آسان نہ تھا۔ ابّا جان پہلے تو امّی جان پر خوب خوب برسے مگر جب دیکھا کہ ان پر ناراض ہونے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تو وہ سیدھے تھانے جا پہنچے۔ پولیس میں رپٹ درج کروانے کے بعد وہ گھر آ گئے۔ ہم سب بے حد پریشان تھے۔ گلی محلے میں اس انوکھی چوری پر ہر شخص حیران ہو رہا تھا۔ فقیروں کو اس روز کسی نے گلی میں گھُسنے نہ دیا بلکہ چند ایک بھیکارنوں کو تو میں نے اور میرے دوستوں نے بُری طرح پیٹا۔ پولیس نے ہمارے گھر آ کر چوری کی ساری تفصیل بھی لکھ لی اور اپنی ضروری کاروائی مکمل کرنے کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے۔

کئی دن تک تھانے میں شہر بھر کے فقیروں اور فقیرنیوں کو اکٹھا کر کے پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ قریباً ہر روز ہی میں اور امّی ان چوروں کی شناخت کے لیے تھانے جاتے رہے مگر وہ دو فقیرنیاں پھر کہیں نظر نہ آئیں۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور ہم سمجھ چُکے تھے کہ معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا ہے۔ دن دہاڑے ان عورتوں نے ہمیں نقدی اور زیور سے محروم کر دیا تھا اور ان کا کوئی اتا پتا نہ ملتا تھا کہ انہیں زمین نِگل گئی کہ آسمان کھا گیا۔

اس واقعہ کے بعد بے چاری امّی جان کی بُری شامت آئی۔ ابّا جان کا مزاج بُہت ہی برہم رہنے لگا۔ وہ بات بے بات امّی جان پر ناراض ہوتے رہتے اور امّی جان کا یہ حال تھا کہ غم اور صدمے کی وجہ سے ان کی صحت بھی ٹھیک نہ رہی۔ ان کا بس نہ چلتا تھا ورنہ وہ پاتال میں سے بھی اُن عورتوں کو نکال کر پھانسی پر لٹکوا دیتیں۔ مگر وہ گھر کی چار دیواری میں بیٹھی اپنی قسمت پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتی رہتیں کہ اُن کی ذرا سی غفلت سے اتنے سالوں کی جمع پونجی برباد ہو گئی تھی۔ نہ پولیس ہی

چوروں کو پکڑ سکی نہ میں ہی کُچھ کر سکا نہ وہ ہی اُن کا کوئی سُراغ نکال سکیں۔ یہاں تک کہ چار مہینے گزر گئے۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد اسکول پھر سے کھُل گئے۔ ہماری فٹ بال کی ٹیم کو جہلم گورنمنٹ سکول کی ٹیم سے میچ کھیلنے کی دعوت ملی جسے ہم نے بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔ اکتوبر کے آخری اتوار کو ہم صبح صُبح گاڑی میں بیٹھ کر جہلم روانہ ہوئے۔ ہمارے اسکول کے پی ٹی آئی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم سب بے حد خوش تھے ہمیں اپنی فتح کا پورا یقین تھا کیونکہ ہماری ٹیم کے تمام لڑکے اس کھیل کے مانے ہوئے کھلاڑی تھے۔ کئی سکولوں کو اس سے پہلے بھی شکست دے چکے تھے اور جہلم کے گورنمنٹ ہائی سکول کی ٹیم نے تو خواہ مخواہ اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ ہم ہنستے کھیلتے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ جس ڈبّے میں ہم بیٹھے وہاں اتنی بھیڑ تھی کہ تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ پنڈی اسٹیشن پر گاڑی رُکی تو میں پانی پینے کے لیے ذرا دیر کے لیے گاڑی سے اُتر کر پلیٹ فارم پر چلا گیا۔ وہاں نلکے پر پانچ چھ آدمی پانی پینے کے لیے اور بھی کھڑے تھے۔ ان کے فارغ ہونے تک میں وہیں

کھڑا رہا۔ ابھی میں اپنی باری کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ گاڑی چل دی۔ میں نے سوچا جب تک گاڑی تیز ہو گی میں دو گھونٹ پانی پی کر اس میں بیٹھ جاؤں گا مگر میرا خیال غلط نکلا۔ ابھی میں پانی پی ہی رہا تھا کہ گاڑی ایک دم تیز ہو گئی اور پوری قوّت سے دوڑنے کے باوجود میں گاڑی نہ پکڑ سکا۔ میری آنکھوں کے سامنے سے گاڑی تیزی سے غائب ہوتی چلی گئی اور میں وہیں اس چھوٹے سے اسٹیشن پر دوسری گاڑی کے انتظار میں ڈھائی تین گھنٹے تک رُکنے کے لیے مجبور ہو گیا۔

مجھے تو سارا مزہ کِرکِرا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ میرے بغیر ٹیم نامکمل تھی۔ اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے اور ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے دوسری گاڑی نہ مل سکتی تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ میرا ٹکٹ بھی ٹیم کے کپتان کے پاس تھا۔ کیونکہ ٹکٹ اُسی نے خریدے تھے۔ اب نہ میں اسٹیشن سے باہر جا سکتا تھا نہ کسی دوسری گاڑی میں ٹکٹ خریدے بغیر بیٹھ سکتا تھا۔ جیب میں پیسے تو موجود ہی تھے۔ میں نے سوچا گاڑی آنے سے کچھ دیر پہلے ٹکٹ خرید لوں گا۔ اس لیے وہیں پلیٹ فارم کے ایک بینچ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

پنّی اسٹیشن ایسی جگہ واقع ہے جس کے ارد گرد خشک پہاڑیوں کا سلسلہ دُور دُور تک پھیلا ہوا ہے۔ گاڑی چکّر کاٹ کر ان پہاڑوں میں سے گزرتی ہے۔ سردیوں میں وہ نظّارہ اتنا دِلفریب ہے کہ جی چاہتا ہے کسی اونچی جگہ بیٹھ کر انسان ان پہاڑیوں کو تکتا ہی رہے۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے کوئی آدھ گھنٹہ ہی گزرا ہوگا کہ مجھے پانچ خانہ بدوش عورتیں پلیٹ فارم پر چلتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ اسٹیشن پار کر کے دوسری طرف جانا چاہتی تھیں، اس وقت اسٹیشن کے پھاٹک پر کوئی بابو موجود نہ تھا اور چھوٹا سا دیہاتی اسٹیشن ہونے کی وجہ سے لوگ گیٹ میں سے گزر کر لائن عبور کر کے دوسری طرف بلا روک ٹوک آجا سکتے تھے۔ جب وہ عورتیں میرے قریب سے گزریں تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے ان میں سے دو تین کو کہیں دیکھا ہے۔ وہ لمبے سیاہ کُرتے اور گھیر دار لہنگے پہنے ہوئی تھیں اور سروں پر چھوٹی چھوٹی گٹھڑیاں اُٹھائے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ تین نوجوان تھیں اور دو عورتیں بوڑھی تھیں۔ میری نگاہیں اُن بوڑھی عورتوں پر جم کر رہ گئیں اور میرے ذہن کے آئینے میں طرح طرح کی شکلوں کا عکس اُبھرنے لگا۔ اُن میں سے ایک عورت کی ٹھوڑی پر زخم کا گہرا نشان صاف نظر آرہا تھا اور

دوسری عورت کے کانوں میں بے شمار سوراخ تھے اور اس کا ایک کان نیچے جھول رہا تھا جیسے کٹا ہوا ہو۔ دونوں کانوں میں اس نے چاندی کے بھاری بھر کم آویزے پہن رکھے تھے اور تب مجھے اپنی ڈیوڑھی میں ملنے والی وہ دو عورتیں نظر آئیں جو ہمارا سب کچھ لُوٹ کر دن دہاڑے رفو چکّر ہو گئی تھیں۔ وہ ایک جھپاکے کے ساتھ میرے قریب سے گزر گئیں اور میں اپنی جگہ سے یُوں اُٹھا جیسے میرا ہاتھ بجلی کے ننگے تار سے چھو گیا ہو۔ یہ تو وہی ڈائنیں ہیں۔ میں نے سوچا اور تیزی سے ان کے پیچھے لپکا۔ مجھے اپنا شک دور کر لینا چاہیے۔

اسٹیشن اس وقت بالکل سنسان پڑا تھا۔ گاڑی گزار کر بابو لوگ شاید اپنے اپنے کوارٹروں میں چلے گئے تھے۔ میں تیز تیز چلتا ہوا اُن پانچ عورتوں سے آگے نکل گیا اور فاصلے پر پہنچ کر پھر انہیں بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ جب وہ دوسری بار میرے قریب سے گزریں تو میرا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ وہ عورتیں وہی تھیں جن کو میں نے اپنی ڈیوڑھی میں سے نکلتے دیکھا تھا۔ خُدا اُن کا بیڑا غرق کرے یہ یہاں کہاں کہاں کر پھر رہی ہیں۔ کہاں وزیر آباد اور کہاں پبّی کہاں گرمیاں

اور کہاں یہ سردیوں کا موسم۔ کہاں میں اور کہاں میرا گھر۔ یا اللہ! اب میں کیا کروں۔ نہ وہاں کوئی پولیس والا ہی نظر آتا جسے میں بتا سکتا نہ اسٹیشن پر ہی کوئی ایسا آدمی نظر آتا تھا جس کو میں اپنی بپتا بتا سکتا۔ کیا ہو گا۔ چور تو میری نظروں کے سامنے پھر رہے تھے۔ میں کیا کروں۔ میں اسی فکر میں ڈوبا ہوا بڑی دیر تک وہاں کھڑا رہا اور وہ عورتیں تیز تیز قدم اُٹھاتی اسٹیشن سے گزر کر لائن عبور کر کے چٹانوں کی طرف بڑھنے لگیں۔ تب مجھے ہوش آیا کہ مجھے ان کا ٹھکانا معلوم کر کے پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔

میں تیزی سے دوڑتا ہوا پلیٹ فارم سے نِکل کر ان کے پیچھے بھاگا۔ میں مشن ہائی سکول وزیر آباد کی فٹ بال ٹیم کی وردی پہنے ہوئے تھا۔ بدن میں ان دِنوں کھلاڑیوں جیسی پھُرتی تھی۔ میں چند ہی منٹوں میں اُن تک جا پہنچا۔ بوڑھی عورت نے یونہی بے خیالی میں پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے اپنی طرف لپکتا دیکھ کر بوکھلا سی گئی۔ چند قدم تیز تیز چلنے کے بعد اُس نے اپنے ساتھ والیوں کو چٹان کی اوٹ میں روک لیا۔ اب اس وقت وہ میری نظر سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ موڑ کاٹ کر میں

دوڑتا ہوا جب چٹان کی دوسری طرف پہنچا تو ایک دم اُن کے ساتھ ٹکرا گیا۔ وہ وہاں کھڑی حیرت سے میرا مُنہ تک رہی تھیں۔ ان میں سے ایک بڑھیا بولی۔

"ہائے وے، تجھے شرم نہیں آتی پتھ بھر کالمڈا جنانیوں کے پیچھے لگا ہے۔ تیرا تالو گنجا کر دوں گی کم ذات کہیں کا۔" اس کی یہ بات سُن کر میں شرمندہ سا ہو گیا۔ مگر پھر ایک دم جو مجھے جوش آیا تو میں نے ان دو بوڑھی عورتوں کو بازوؤں سے پکڑ لیا اور کہا۔

"میں تم دونوں کو پہچان گیا ہوں۔ تم نے وزیر آباد ہمارے گھر سے چار مہینے پہلے جو روپیہ اور زیور اور کپڑے چُرائے تھے وہ یہیں رکھ دو ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔"

میری یہ بات سُن کر ان دونوں کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ چند لمحوں تک وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتی رہیں مگر پھر انہوں نے اپنی اس حالت پر قابو پایا اور اپنے بازو میرے ہاتھ سے چھڑا کر مجھے دھکا دیتی ہوئی الگ ہٹ گئیں۔

ایک بولی۔ ”تیرا دماغ تو ٹھیک ہے لمڈے۔ کیسی چوری کیسے زیور۔ تو کہیں بھنگ تو نہیں پی گیا۔“

”میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے مائی۔ خیریت اسی میں ہے کہ تو وہ سارا مال مجھے واپس کر دے۔ ورنہ میں پولیس کو بُلا کر ابھی تم سب کو پکڑوا دوں گا۔“ میں نے بڑے غصّے کے ساتھ کہا۔ میری بات سُن کر دوسری بڑھیا بولی۔

”پُتر تُجھے اتنا ناراج نہیں ہونا چاہیے۔ تجھے ہم پر سک ہے تو چل ہم تیرے کا سک رپھا کر دیں گے۔ چل اُدھر ہمارے جھگّی میں ہمارے پیر کے پاس۔ وُہ تیری تسپھی کر دے گا۔“

”ہاں چلو۔ میں دیکھتا ہوں تمہارا پیر کیا کہتا ہے۔ مگر یاد رکھو اگر تم نے ہمارا مال واپس نہ کیا تم مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔“ میں نے غصّے سے تپتے ہوئے کہا۔ یہ بُڑھیا کُچھ سمجھ دار معلوم ہوتی ہے۔ اور اسے پتا چل گیا کہ اب اکڑ فوں اور نہ مکر سے کام چلے گا۔ مال دینا ہی پڑے گا۔ میں نے سوچا کہ اب یہ مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتیں۔ انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ میں باتوں سے ٹلنے والا نہیں ہوں۔ اب یہ

ہمارا مال ہضم نہیں کر سکیں گی۔ یہ سوچتا ہوا میں ان کے ساتھ چل دیا۔ مجھے کسی قسم کا کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا اور میں خوب اکڑ کر چھاتی پھُلا کر ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ کہاں کی ٹیم کہاں کا میچ۔ سب کچھ اُلٹ پلٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ قدرت بھی بڑی کار ساز ہے کہ اگر میں پانی پینے وہاں نہ اُترتا تو ان چوروں کی تلاش قیامت تک نہ کر سکتے تھے۔ اللہ کتنا مہربان ہے کہ راہ چلتے اس نے مجھے چوروں کے گھر تک پہنچانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ پبّی اسٹیشن سے چار فرلانگ دُور مغرب کی طرف چٹانوں کے طویل چکر دار سلسلے سے گزر کر مجھے ایک جگہ خانہ بدوشوں کے چند خیمے نظر آئے۔ وہ عورتیں سارا راستہ بالکل خاموش رہیں۔ میں ان کے پیچھے سنتریوں کی طرح اکڑ کر چل رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں ان لوگوں سے اپنا سارا مال نکلوا کر واپس آؤں گا۔ کتنی خوشی ہو گی امّی جان کو اپنا زیور دیکھ کر اور ابّا جان تو بہت ہی خوش ہوں گے کہ ان کی کھوئی ہوئی چیزیں اُن کا اپنا بیٹا اُنہیں واپس لا دے گا۔"

ایک صاف سُتھرے خیمے کے قریب جا کر اس بڑھیا نے کہا۔

”چل پُتر۔ اندر بیٹھ جا۔ یہ تیرا اپنا ہی گھر ہے۔ ہمارا پیر ساب بھی اندر بیٹھا ہے۔ چل میرا پُتر۔“ اس کی آواز میں بڑی نرمی اور لجاجت تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ بری طرح خوف زدہ ہو چکی ہے۔ چور جب پکڑا جاتا ہے تو اس سے بات بنائے نہیں بنتی۔ یہی حال کچھ اس کا تھا۔

”میں اندر بیٹھنے کے لیے نہیں آیا مائی۔ مجھے ہمارا مال واپس ملنا چاہیے۔ چودہ سو روپیہ اور زیور اور کپڑے۔ تُم نے میری امّی جان کو دوپہر کے وقت بے ہوش کر کے گھر کا صفایا کر دیا تھا۔ تم سمجھتی ہو تمھیں کوئی پکڑ ہی نہیں سکتا۔ ڈیوڑھی میں سے گزرتے ہوئے میں نے تم دونوں کو دیکھا تھا۔ مجھے پتا ہوتا تو میں اسی وقت تم دونوں کی گردن ناپتا مگر خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ہمارا مال سیدھی طرح باہر نکال دو۔ میرے ابّا جان بھی اسٹیشن پر بیٹھے ہیں اور وہ پولیس لے کر پیچھے آتے ہی ہوں گے۔ اگر خیریت چاہتی ہو تو ہمارا مال نکال دو۔“ میں نے ابّا جان کا نام محض اُن کو دھمکانے کے لیے لیا تھا اور میں چیخ چیخ کر بُلند آواز سے یوں باتیں کر رہا تھا جیسے کسی مجمعے کو سنا رہا ہوں۔ دراصل ان کے ٹھکانے پر آ کر پہلی بار مجھے

محسوس ہوا کہ مجھے وہاں نہیں آنا چاہیے تھا اور اب جب کہ میں وہاں پہنچ چکا تھا میں اپنی کسی بات سے ان پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں خوفزدہ ہو رہا ہوں۔ ایسا کرنے سے وہ اور بھی شیر ہو سکتے تھے۔ میری باتیں سن کر اس مائی کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ تیزی سے خیمے کا پردہ اُٹھا کر اندر چلی گئی اور چند لمحوں بعد وہ باہر آئی تو اس کے ساتھ دو لمبے لمبے گرانڈیل خانہ بدوش تھے اور ان دونوں کے پیچھے لمبی لمبی جٹاؤں والا سبز عبا میں ملبوس ایک نیک صورت آدمی تھا جس کی آنکھوں میں سرمہ لگا تھا اور جس کے سر پر بڑی سی سبز پگڑی بندھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں گز بھر لمبی تسبیح تھی۔ ”کیا بات ہے پُتر۔ تُم اتنے ناراض کیوں ہو رہے ہو۔“ اس پیر صاحب نے صاف سُتھرے لہجے میں پُوچھا۔ اس کی بات سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک شریف آدمی سے ہمکلام ہوں۔

”بات کیا ہونی ہے جناب۔ یہ مائی اور وہ دوسری مائی دونوں نے مل کر چار مہینے پہلے دوپہر کے وقت ہمارے گھر میں میری امّی جان کو جادو ٹُونے کے بہانے سے پہلے بے ہوش کیا اور پھر نقدی زیور اور کپڑے چُرا کر بھاگ آئیں۔ میں ان کو اچھی

طرح پہچان گیا ہوں۔ ان کی تلاش میں ہم نے سارا پاکستان چھان مارا ہے۔ اب آپ ان سے ہمارا مال واپس دِلا دیں تو بہتر ہے۔ ورنہ میں ابھی پولیس کو لے آؤں گا۔" میں نے بڑے اطمینان سے اس شخص کو بات سمجھائی۔

"تمہیں دھوکا ہوا ہے بیٹا۔ یہ خانہ بدوش لوگ ہیں۔ انہیں دنیا کا لالچ نہیں ہوتا۔ اگر یہ چوریاں کر سکتے تو ان کا یہ حال کیوں ہوتا کہ نہ اِن کو رہنے کے لیے گھر ملتا ہے نہ کھانے کے لیے روٹی۔" اس شخص نے کہا۔

"آپ سمجھتے ہیں مجھے دھوکا ہوا ہے۔ میں اس مائی کے ٹھوڑی کے زخم اور اس مائی کے کٹے ہوئے کان کو کبھی نہیں بھُول سکتا جناب۔ اگر یہ سیدھی طرح نہ مانیں تو پھر مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔" میں نے بڑے رعب دار انداز سے کہا جیسے سارے جہان کا اختیار میرے ہی ہاتھ میں آ چکا ہو۔

"تمہارا گھر کہاں ہے بیٹا؟" اس شخص نے پھر بڑے تحمّل کے ساتھ پُوچھا۔

"جی ہمارا گھر وزیر آباد میں ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر بیٹا یہ لوگ تو پورا ایک سال پنڈی کے علاقے میں گزارنے کے بعد پچھلے ہفتے ہی اِدھر آئے ہیں۔ یہ مائیاں وزیر آباد کیسے چلی گئیں۔" اس نے کہا۔

"آپ جو جی چاہے کہتے رہیں مگر میں ان کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اب جا رہا ہوں اور ابھی پورا انتظام کر کے واپس آؤں گا۔ میں دیکھوں گا یہ کس طرح ہمارا مال واپس نہیں کرتیں۔" میں نے کہا اور واپس مُڑنے لگا۔

"ٹھہرو! تم یہاں فیصلہ کر کے جاؤ کہ تمہارا چور کون ہے۔ آؤ اندر بیٹھ کر بات کرو۔" اس نے کہا مگر میں چند قدم دور آ چکا تھا۔ اس پر ایک خانہ بدوش آدمی تیزی سے میرے پیچھے لپکا تو میں تیز دوڑنے لگا۔ اب میرے اور اس کے درمیان تیز دوڑنے کا مقابلہ ہونے لگا تھا۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو وہ خانہ بدوش مجھ سے تین گز دور رہ چکا تھا۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ اب میں اپنے دل میں بُری طرح خوفزدہ ہو رہا تھا کیونکہ ان کی نیّت نیک نظر نہ آتی تھی۔ کچھ فاصلہ طے کر کے میں نے ایک بار پھر پیچھے جو نگاہ ڈالی تو میرے اور اس کے درمیان فاصلہ زیادہ ہو چکا تھا میں اس سے بہت تیز دوڑ رہا تھا۔ اور اب وہ دوسرا نوجوان بھی

تیزی سے میرے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ میں چٹانوں کے اوپر پھلانگتا ہوا بجلی کی طرح دوڑ رہا تھا۔ مجھے ان لوگوں سے اپنی جان بچانے کی فکر لگی تھی۔ خُدا جانے وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ اچانک مجھے اپنے سامنے ایک خانہ بدوش آدمی نظر آیا۔ پیچھے سے میرا تعاقب کرنے والوں نے بلند آواز سے پکار کر اسے خبردار کر دیا تھا۔ جونہی میں اس کے قریب سے گزرنے لگا اس نے اپنا ہڈیوں سے بھرا ہوا تھیلا پوری قوّت سے میری طرف پھینکا۔ ہڈّیاں بکھر کر میرے جسم سے ٹکرائیں۔ میں نے فوراً اپنا رُخ موڑا اور مشرق کی طرف بھاگنے لگا۔ اب وہ تینوں میرے پیچھے بھاگ رہے تھے، اور وہ شخص جس نے ہڈّیوں کا تھیلا مُجھے مارا تھا میرے بہت ہی قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ دوسروں کی نسبت کہیں زیادہ تیز دوڑ رہا تھا۔

اب میرا دم پھُولنے لگا تھا۔ وہ تیسرا شخص بالکل میرے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے ایک چٹان کی اوٹ میں ٹھہر کر اچانک ایک پتھّر اُٹھا کر اس کی طرف مارا تو وہ ٹھیک اس کے سینے میں لگا۔ دوڑتے دوڑتے وہ ایک دم تیورا کر نیچے گر گیا۔ اس کا

پاؤں کسی پتھّر سے اُلجھا تھا اور سینے میں درد کی وجہ سے وہ اپنا توازن کھو بیٹھا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں ایک بار پھر پوری قوّت سے اسٹیشن کی طرف بھاگا۔ مگر اب میری رفتار سست پڑ چکی تھی۔ خوف کی وجہ سے اس دوڑ نے میرا جوڑ جوڑ ہلا دیا تھا۔ پھر بھی میں دوڑ رہا تھا کیونکہ وہ لوگ ابھی تک میرا پیچھا کر رہے تھے۔

میں ان پتھریلے راستوں سے بالکل ناواقف تھا۔ خدا جانے میں کہاں بھُولا تھا کہ اسٹیشن ہی مُجھ سے دور ہوتا جارہا تھا اور پھر اچانک ایک خانہ بدوش نے اُونچی چٹّان پر ٹھیک میرے اُوپر چھلانگ لگائی۔ اگر میں کھڑا ہوتا تو اس کے بوجھ تلے ہی کچلا جاتا مگر وہ میرے سامنے گرا تھا۔

پیشتر اس کے کہ وہ سنبھل پاتا میں نے اپنا رُخ موڑ لیا اور دوسری طرف ایک تنگ سی گھاٹی کی طرف بھاگنے لگا مگر وہ آدمی بہت ہی تیز نکلا۔ وہ بجلی کی سی سُرعت کے سات اُٹھ کر میرے پیچھے لپکا اور دسویں گز پر مُجھ تک آ پہنچا۔ میں نے چٹان کے ساتھ سہارا لے کر پُوری قوّت سے اس کے پیٹ میں لات جمائی مگر



اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں اب اس سے پوری طرح گتھم گتھا ہو چکا تھا۔ اور پہلی پکڑ میں ہی مجھے محسوس ہو گیا کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ پھر بھی میں نے اس کے سامنے ہمّت نہ ہاری اور مسلسل اس کے ساتھ لڑتا رہا۔ ایک ٹکر تو میں نے اس کی ناک پر ایسی بھی ماری کہ اُس کا خون بہہ نکلا جس کی وجہ سے وہ کچھ حواس باختہ سا ہو گیا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر پوری قوّت سے ایک گھونسہ اس کی کنپٹی پر جمایا مگر مکّوں اور گھونسوں کا تو اس کے ورزشی بدن پر کوئی اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ مگر اب اس کے حملوں میں وہ پہلی سی شدّت نہ رہی تھی۔ ناک کا خون صاف کرنے کے لیے اس نے ایک لمحے کے لیے آستین اُوپر اُٹھائی تو میں پھر بھاگ اُٹھا مگر اب اس کے ساتھی بھی آ پہنچے تھے اور ان تینوں کے مقابلے میں میری کوئی پیش نہ چلتی تھی۔ مگر پھر بھی جب گا میرے ہوش قائم رہے اُن کے ساتھ لڑتا رہا۔ ان تینوں نے میرے حملوں سے بچنے کے لیے مجھے اتنا مارا کہ میں بالکل بے سُدھ ہو کر گر پڑا اور مجھے بالکل ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں۔

وہ مجھے بے ہوشی کی حالت میں اُٹھا کر اپنے ٹھکانے پر لے گئے۔ خُدا جانے میری بے ہوشی کے عالم میں ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا البتہ جب مجھے ہوش آیا تو میرا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا اور ان لوگوں نے میرے ہاتھ پاؤں چارپائی کے ساتھ جکڑ کر باندھ رکھے تھے اور ایک خوفناک شکل صورت کا خانہ بدوش میرے سامنے خیمے کی دیوار کے ساتھ بیٹھا حقّہ پی رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں برچھی تھی۔ جب میری آنکھ کھلی اور میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے برچھی کی نوک آہستہ سے میری ران میں چبھوئی اور بولا۔

”ہوں چھوکرے۔ تیرے کے اَم چور ایں؟ تیرے ڈکرے کر کے کتّوں کو کھلا دینگا۔ اگر تو نے پھر بک بک کی تو۔ سمجھا کہ نہیں سمجھا۔ کاں تیرا باپو اسٹیشن پر بیٹھا ام اُس کے بھی ڈکرے کر دیں گے۔ بَک بَک کرتا تھا۔ امارا ابّا یان اسٹیشن پر بیٹھا وہ پُلس لائینگا۔ کاں گئی تیرے کی پُلس۔ ام تیرے کا پلستر کر دیں گا۔“

اب اُدھر کی سُنیے۔ جب گاڑی روانہ ہو گئی تو جہلم پہنچ کر ہمارے پی ٹی ماسٹر احمد سلیم کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ حیدر غائب تھا۔ ان کو کیا معلوم کہ حیدر پر

کیا بیت چکی ہے۔ میرے ساتھیوں کا خیال تھا کہ میں پچھلے ڈبے میں بیٹھ چکا ہوں گا۔ اسی وجہ سے انہوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ مگر جب جہلم جا کر میں اُنہیں نہ ملا تو سب بے حد پریشان ہوئے کیونکہ میرے بغیر ان کی ٹیم ہی نامکمل تھی۔ ماسٹر صاحب کو مجھ پر بہُت زیادہ بھروسہ تھا۔ کیونکہ میں اسکول کی ٹیم کا بہترین کھلاڑی تھا۔ گیند اور میں میدان میں یُوں ہو جاتے تھے جیسے ہمارا جنم جنم کا ساتھ ہو۔ کسی کی مجال نہیں ہوتی تھی کہ میرے آگے چڑھا ہوا گیند چھین کر لے جائے۔ میرے بغیر ِکسی میچ کو جیت لینا ان کے لیے قریباًنا ممکن تھا۔ ماسٹر صاحب نے کھلاڑیوں کو سکول پہنچایا اور دو لڑکوں کو ساتھ لے کر اسی وقت ٹیکسی میں بیٹھ کر پنّی کی طرف روانہ ہو گئے۔ دوسری گاڑی اس اسٹیشن سے ساڑھے گیارہ بجے نکلتی تھی۔ اور وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر پونے گیارہ بجے پنّی پہنچ گئے۔ اُنہیں یقین تھا کہ اگر میں گاڑی میں نہیں بیٹھ سکا تھا تو ابھی تک اسٹیشن پر ہوں گا۔ جہلم سے روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے بسوں نے اڈّے بھی دیکھ لیے تھے مگر میں وہاں بھی نہ ملا تھا اور یہ ان کی ذمّہ داری تھی کہ وہ سب لڑکوں کو حفاظت کے ساتھ لے جائیں اور احتیاط کے ساتھ واپس لائیں۔ اب وہ دوسری مُصیبت میں گرفتار

تھے۔ میچ پر بھی پانی پھرتا نظر آتا تھا اور لڑکے کی گمشدگی کی بھی تمام تر ذمّہ داری ان پر عائد ہوتی تھی اور وہ اسی پریشانی میں مبتلا ہو کر دیوانوں کی طرح جگہ جگہ تلاش کرتے ہوئے پبّی اسٹیشن پر جا پہنچے۔

یہ میری بد قسمتی تھی کہ جتنا عرصہ میں وہاں پلیٹ فارم پر بیٹھا رہا وہاں نہ تو کوئی بابو ہی مجھے دیکھ سکا نہ کوئی مسافر ہی۔ ماسٹر صاحب نے ہر ایک سے پوچھا مگر کوئی بھی نہ بتا سکا کہ اس حلیے کا کوئی لڑکا اس نے دیکھا تھا۔ پوچھتے پوچھتے وہ پلیٹ فارم پر دوسری طرف نکل گئے۔ میں نے تو کوئی خیال نہ کیا تھا مگر ایک کانٹے والے نے مجھے پہاڑیوں کی طرف جاتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے ماسٹر صاحب کو بتایا کے ہاں اس حلیے کا ایک لڑکا کُچھ ہی دیر پہلے ان پہاڑیوں کی طرف جا رہا تھا۔ وہ اب تک واپس نہیں آیا۔

ماسٹر صاحب ان دونوں لڑکوں کے ساتھ جن میں سے ایک کا نام حبیب تھا اور دوسرے کا اکبر ان پہاڑیوں کی طرف چل دیے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اسٹیشن چھوڑ کر گاڑی چھوڑ کے ٹیم ترک کر کے ان پہاڑیوں کی طرف کس

لیے چلا گیا تھا۔ وہ سمجھے میرا دماغ خراب ہو چکا ہے ورنہ کوئی بھی سمجھ دار آدمی ایسے حالات ورنہ حالات میں یوں جنگل کا رُخ کس طرح کر سکتا ہے۔ وہ کافی دیر تک اِدھر اُدھر ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں اور نوکیلی چٹانوں پر پھرتے رہے مگر انہیں میرا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

جہاں میں نے اُس خانہ بدوش کی ناک پر ٹکر ماری تھی وہاں انہیں دھول پر بہت سے قدموں کے نشان ملے۔ کچھ خون کے چھینٹے بھی نظر آئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرا قلم وہاں لڑائی میں گر گیا تھا۔ اس قلم کو اکبر خُوب پہچانتا تھا۔ وہ بولا۔

"ماسٹر صاحب، میں قسم کھا سکتا ہوں کہ یہ قلم حیدر کا ہی ہے۔"

"مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خون کے چھینٹے، یہ بہت سے قدموں کے نشان اور یہ قلم آخر کیا ظاہر کرتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اس بے چارے کے ساتھ کوئی زبردست حادثہ ہو چکا ہے۔ خدا کرے وہ زندہ ہو۔ مجھے تو شُبہ ہے کہ

جن لوگوں نے اس پر حملہ کیا ہے، وہ اسے زندہ یا مردہ اُٹھا کر اپنے ساتھ ہی لے گئے ہیں۔" ماسٹر صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔

وہ خوب گھٹے ہوئے بدن کے چھ فُٹے جوان تھے۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ جوانی تو اس شخص پر آئی ہے کہ جہاں یہ بیٹھتا ہے وہ جگہ بھی بارُعب بن جاتی ہے۔ اکبر نے بعد میں مجھے بتایا کہ وہ ماسٹر صاحب میرے لیے وہاں اُن چٹانوں کے قریب کھڑے یوں پریشان ہو رہے تھے جیسے ان کا اپنا بچّہ گُم ہو گیا ہو۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ حبیب سے مخاطب ہو کر بولے۔

"حبیب بیٹا ہم حیدر کو یہاں تلاش کرتے ہیں۔ تم جا کر پولیس کو اطلاع دو۔ یہ رقعہ لے جا کر تھانیدار کو دے دینا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ فوراً یہاں آ جائے گا۔"

"میں رقعہ تو لے جاتا ہوں ماسٹر صاحب مگر تھانہ یہاں سے پتا نہیں کتنی دور ہو گا۔" حبیب نے کہا۔ وہ بھی اس جگہ بالکل اجنبی تھا، جیسے دوسرے تھے۔

”اسٹیشن پر جا کر معلوم کر لینا۔ تھانہ کہیں اُدھر گاؤں کے قریب ہو گا۔“ ماسٹر صاحب نے یہ کہہ کر اپنی نوٹ بک کا ایک کاغذ پھاڑ کر اس پر تھانیدار کے نام رقعہ لکھا اور حبیب کو تھانے کی طرف روانہ کر دیا اور خود میری تلاش میں اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔

پھرتے پھراتے وہ آخر خانہ بدوشوں کے اُن خیموں کی طرف آ نکلے کیونکہ پگڈنڈی پر جن قدموں کے نشان ملے کے تھے وہ ان نشانات سے ملتے جُلتے تھے جو انہوں نے اس جگہ دیکھے تھے جہاں سے انہیں میرا قلم ملا تھا۔

خانہ بدوشوں کے سات خیمے قریب قریب لگے تھے۔ ماسٹر صاحب اپنے حُلیے سے بالکل کوئی پولیس افسر معلوم ہوتے تھے۔ اکبر بھی کھُلے ہاتھ پاؤں کا جوان تھا۔ وہ میرے ساتھ ہی دسویں میں پڑھتا تھا اور بہت ہی نڈر تھا۔ جونہی خانہ بدوشوں نے ان کو خیموں کی طرف آتے دیکھا تو وہ گھبرا اُٹھے۔ ایک خانہ بدوش تیزی سے اُس خیمے میں گھُسا جہاں میں بندھا پڑا تھا۔ وہاں بیٹھے ہوئے خانہ بدوش کو اس نے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”وہ آئے ہیں، اس مُصیبت کو ڈھونڈنے آئے ہیں۔“

”کون آئے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔ ”اس کے ساتھی۔“ دوسرے نے جواب دیا۔

اس پر میرے سامنے بیٹھا ہوا خانہ بدوش برچھی اُٹھا کر باہر نکل گیا۔

میں نے موقع غنیمت سمجھ کر اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوّت سے چیخ کر کہا۔ ”بچاؤ بچاؤ۔ میں یہاں بندھا پڑا ہوں۔ بچاؤ۔“

میری یہ آواز ماسٹر صاحب کے کانوں میں پڑی تو وہ چیتے کی سی پھرُتی کے ساتھ میرے خیمے کی طرف بڑھے۔ مگر ان خان بدوشوں نے اُن کو اندر آئے سے زبردستی روک دیا۔ ایک خانہ بدوش خیمے میں گھُسا اور میرے مُنہ پر زبردست طمانچہ مار کر گھُٹی ہوئی آواز سے بولا۔

”خبردار اگر تَیں نے کوئی واج نکالی تو ڈکرے کر دیں گا۔“ یہ کہہ کر اُس نے ایک کپڑے کے ساتھ کَس کر میرا مُنہ باندھ دیا۔ باہر سے مجھے ماسٹر صاحب کی آواز آئی۔

”مگر تُم نے اسے کیوں باندھ رکھا ہے۔ اس نے تمہارا کیا قصور کیا ہے؟“

”وہ ہمارا آدمی ہے۔ تم جاؤ اپنا کام کرو۔ ہم تمہیں اندر نہیں جانے دیں گے۔“ یہ کسی خانہ بدوش کی آواز تھی جو صاف ستھری اردو بول سکتا تھا۔

”جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا ہو گا، میں تم سب لوگوں کو جیل بھجوا دوں گا۔“ ماسٹر صاحب نے کہا۔

”اوہ بَک بَک مت کر۔ جا اپنا کام کر، بڑا آیا جیل والا۔ جا دفع ہو یہاں سے۔“ ایک خانہ بدوش نے کہا۔ اس پر نہ جانے کیا ہوا باہر سے مجھے دھینگا مُشتی کی آوازیں آنے لگیں۔ ان لوگوں نے ماسٹر صاحب پر حملہ کر دیا تھا۔ میں یہ آوازیں سن کر ایک دم بے چین ہو گیا اور پوری قوّت کے ساتھ چارپائی پر سے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ گرہیں بُہت مضبوط بندھی تھیں۔ میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں جکڑے ہوئے تھے۔ مگر مسلسل کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ چارپائی اُلٹ کر خیمہ کو پھاڑتی ہوئی باہر گر گئی۔

اب میں ان لوگوں کو صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ ماسٹر صاحب نے ایک خانہ بدوش کی برچھی چھین لی تھی اور ایک لاٹھی اکبر کے ہاتھ میں تھی اور وہ دونوں آٹھ خانہ بدوشوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ماسٹر صاحب کے حملوں سے چار خانہ بدوش لہولہان ہو رہے تھے۔ کسی کی ران میں زخم لگا تھا تو کسی کے بازو میں۔ کسی کی پسلی سے خُون بہہ رہا تھا تو کسی کے سر سے۔ اکبر بھی خوب اپنے جوہر دکھا رہا تھا۔ خانہ بدوشوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور کلہاڑیاں تھیں اور ایک کے ہاتھ میں تلوار تھی اور ایک کے ہاتھ میں برچھی۔ ماسٹر صاحب کی پگڑی ان کے سر پہ نہ تھی۔ مگر وہ اتنی پھُرتی اور تیزی سے برچھی گھما رہے تھے کہ خانہ بدوش برابر پیچھے ہٹتے جاتے تھے۔ جہاں اکبر کو موقع ملتا تھا وہ ایک آدھ کے سَر میں لاٹھی دے مارتا تھا۔ پھر تو یُوں ہوا کہ عورتیں بھی مقابلے میں نکل آئیں۔ انہوں نے اکبر کو گھیرے میں لے لیا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ عورتیں اپنے مردوں سے کہیں زیادہ خونخوار ثابت ہو رہی تھیں۔ انہوں نے اکبر کو پرے لے جا کر جان سے ہی مار دینے کی کوشش کی۔ ہوا یوں کہ اکبر کا پاؤں خیمے کی ایک رسّی سے اُلجھ گیا جس کی وجہ سے وہ اچانک نیچے گِرا۔ اس پر ان عورتوں نے اس

پر خنجروں سے حملہ کر دیا۔ وہ تو اکبر کی قسمت اچھی تھی کہ اس نے ایک دم ایک عورت کو اپنے اوپر لٹا دیا ورنہ وہ خنجر جو اس عورت کے شانے میں لگا تھا سیدھا اس کے سینے میں اُتر جاتا۔ پھر تو اکبر نے اس عورت کو ڈھال بنا کر ان عورتوں کی لاٹھی سے خوب خبر لی۔ عاجز آ کر وہ پیچھے ہٹ گئیں مگر چار خانہ بدوش جوان ابھی تک ماسٹر صاحب سے لڑ رہے تھے۔ چار ایسے تھے جو بُری طرح زخمی ہو کر ڈھیر ہو چکے تھے۔

ابھی یہ جنگ جاری ہی تھی کہ اب ایک چٹانوں کی طرف سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو حبیب پولیس کے چار جوانوں کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ تھانے تو نہ پہنچ سکا تھا وہیں اسٹیشن پر گشتی ریلوے پولیس کے چند سپاہی اُسے مل گئے تھے جو ساڑھے گیارہ بجے کی گاڑی سے پبّی اسٹیشن پر اُتر گئے تھے۔ حبیب نے اُن کو رقعہ دکھا کر سارا واقعہ بتایا تو وہ بولے: ”یہ ایسا معاملہ ہے کہ مجرموں کے پیچھے ہمیں جانا چاہیے کیونکہ وہ لڑکا ریل کا مسافر تھا۔“

یہ کہہ کر وہ چار جوان جن میں سے ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا حبیب کے ساتھ آ گئے تھے۔ وہ چاروں کے چاروں مسلّح تھے۔

گولی کی آواز سُن کر خانہ بدوشوں کے پسینے چھوٹ گئے اور وہ اپنے ہتھیار پھینک کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ مگر سپاہی اتنے میں سر پر آ پہنچے تھے۔ دو کو تو ماسٹر صاحب نے اپنی بغل میں دبا لیا، اور باقی عورتوں اور مردوں کو جانوروں کی طرح ہانک کر ان سپاہیوں نے ایک جگہ اکٹھا کیا۔

میرے بھی جکڑ بند انہوں نے فوراً کھول دیے۔ ماسٹر صاحب کے بائیں بازو پر برچھی کا زخم تھا جس پر سپاہیوں نے فوراً مرہم پٹّی کر دی۔ وہ خانہ بدوش اسی طرح زخمی حالت میں پڑے رہے۔ بلکہ سپاہیوں نے انہیں اور بھی جُوتے لگائے۔

جب تمام حالات پر سپاہیوں نے قابو پا لیا تو وہ مجھ سے میری بپتا پوچھنے لگے۔ میں نے الف سے لے کر ے تک سارا قصّہ انہیں سنایا تو وہ ہیڈ کانسٹیبل بولا:

”وہ عورتیں کون سی ہیں۔ ذرا تم ان پر انگلی رکھو۔ دیکھو تو ہم کیا کرتے ہیں۔“میں نے تمام عورتوں کو غور سے دیکھا مگر وہ دونوں بوڑھیاں وہاں موجود نہ تھیں۔

”وہ تو اب یہاں نظر نہیں آتیں جناب۔ ایک اِن کا پیر ساب بھی تھا۔ وہ بھی اب یہاں نہیں ہے۔“

”وہ دونوں بوڑھیاں کہاں ہیں۔ اُن کو نکالو ورنہ تم سب کو ہم جیل میں ڈال دیں گے۔“ ہیڈ کانسٹیبل نے گرج کر کہا۔

”ہجور یہ چھوکرا جھوٹ بولے ہے۔ تہمت لگاوے ہے، ہم سریپھ آدمی ہیں۔ محنت مجوری کرت ہیں۔ چوری کاہے کو کرت بھلا۔“ ایک جوان عورت نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

”بکواس مت کرو۔ وہ بوڑھیاں نکالو ورنہ ہم تمہاری کھال کھینچ لیں گے۔ کمال ہے چور ہی غائب ہو گئے۔ واہ!“ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا اور سب کے سب خیمے اُس نے اکھاڑ مارے۔ پھر وہ ان کی ایک ایک چیز کی تلاشی لینے لگے۔ اس کام میں ہم نے سپاہیوں کا ہاتھ بٹایا۔

ان کے ٹرنکوں میں رنگ برنگ کے خوبصورت کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ کئی نئے سوٹ کیس ان خیموں سے برآمد ہوئے جن کو وہ لوگ اپنے میلے کچیلے بستروں میں لپیٹ کر رکھتے تھے۔

"یہ سب کپڑے یہ شنیل کے، ساٹن کے، جارجٹ کے، لیڈی ہملٹن کے کپڑے تمہاری مائیں پہنا کرتی ہیں۔ بتاؤ بدبختو! یہ سب مال تم نے کہاں سے مارا ہے۔ غضب خدا کا۔ چور تو سامنے پھرتے رہتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں یہ خانہ بدوش بے چارے ہیں۔ لعنت ہے ان کی زندگی پر۔" ہیڈ کانسٹیبل سخت جوش میں بھرا ہوا تھا۔ اس نے ان سب کو ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ جب ہتھکڑیاں کم رہ گئیں تو اس نے رسّیوں کے ساتھ باقی عورتوں اور مردوں کے ہاتھ باندھ دیے۔ ابھی ان کے سامان کی تلاشی جاری تھی۔ میں، ماسٹر صاحب، حبیب اور اکبر اُن کا پورا پورا ساتھ دے رہے تھے۔ اچانک ایک ٹرنک جو میرے سامنے ایک سپاہی نے کھولا تو اس میں مجھے ایسے کپڑے نظر آئے جو میرے دیکھے بھالے معلوم ہوتے تھے۔ میں دوڑ کر آگے بڑھا اور ان کپڑوں کو دیکھنے لگا۔ شنیل کا آسمانی رنگ کا سوٹ

یقیناً امّی جان کا تھا۔ شلوار کے پائنچے پر تیز گرم استری کا داغ میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ میرے ہاتھ سے استری گرنے کی وجہ سے لگا تھا اور اب وہ سوٹ میرے سامنے دھرا تھا۔

"ماسٹر صاحب! یہ سوٹ میری امّی جان کا ہے۔ دیکھا آپ نے۔ دوسرے کپڑے بھی یہیں کہیں ہوں گے۔ وہ دونوں بوڑھیاں ان لوگوں نے خدا جانے کہاں بھیج دی ہیں۔ زیور بھی ان کے پاس ہوں گے۔" میں نے سب لوگوں کو وہ سوٹ دکھاتے ہو کہا۔

اس پر ان سپاہیوں نے دو خانہ بدوشوں کو بیلٹ سے پیٹنا شروع کر دیا اور بولے۔

"بتاؤ وہ دونوں بوڑھیاں کہاں گئی ہیں اور اس سوٹ کے ساتھ کا باقی سامان کہاں ہے۔" مگر وہ تو کچھ نہ بتانے کی قسم کھائے ہوئے تھے۔ ٹس سے مَس نہ ہوئے۔

جب خانہ بدوش مردوں کو مار پیٹ کر سپاہی تھک گئے تو پھر وہ عورتوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور انہیں خیموں سے ایک طرف لے جا کر پوچھنے لگے۔ وہ سپاہیوں کی اس تکلیف دہ تفتیش سے گھبرا کر جلد ہی حقیقت اگلنے لگیں۔

تب میں معلوم ہوا کہ ان دونوں بوڑھیوں میں ایک کا نام ماکھاں تھا اور دوسری کا شپاکی۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ دونوں اپنا سامان سمیٹ کر وہاں سے رفو چکر ہو گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ دونوں بس میں بیٹھ کر لالہ موسیٰ چلی گئی ہوں گی۔ کیونکہ ان کے رشتہ داروں کا ڈیرہ وہیں بسوں کے اڈّے کے پاس اُترا ہوا ہے۔ جس ٹرنک میں سے وہ سوٹ نکلا تھا وہ مائی شپاکی کی بہو کا تھا۔ اس نے بتایا کہ مائی شپاکی نے باقی سوٹ جو وہ وزیر آباد سے لائی تھی اپنی تینوں بیٹیوں میں بانٹ دیے تھے۔ زیور اور روپیہ البتہ ابھی تک اس کے پاس موجود ہے۔ کُچھ اور چوریوں کا بھی ان لوگوں نے اعتراف کیا۔ اس پر وہ سپاہی ان سب لوگوں کو باندھ کر اسٹیشن کی طرف لے چلے۔ اس قافلے میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ چند ایک بوڑھوں کو وہیں چھوڑ دیا گیا تاکہ وہ بچّوں کی دیکھ بھال کریں کیونکہ وہ بچّے اپنی ماؤں کو پولیس کے ساتھ جاتے دیکھ کر رونے لگے تھے مگر ان سے ہمیں بالکل کوئی ہمدردی نہ تھی۔ کیونکہ وہ سب لوگ اسی طرح چوری چکاری پر گزر بسر کرتے تھے اور بظاہر خانہ بدوش بنے پھرتے تھے۔ دودھ پیتے بچّوں کو ماؤں نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

پنّی اسٹیشن پر پہنچ کر اگلی گاڑی سے ہم سب لالہ موسیٰ روانہ ہو گئے۔ اب نہ تو کسی کو میچ کا ہوش تھا نہ کسی اور بات کی خبر لینے کی دھن تھی۔ ماسٹر صاحب البتّہ بُہت فکر مند تھے۔

بہر حال لالہ موسیٰ پہنچ کر ماسٹر صاحب نے جہلم کی ٹیم کے کپتان کو ٹیلیفون کر دیا کہ میچ دو دن تک ملتوی کر دیا جائے کیونکہ ہم ایک الجھن میں پھنس چکے ہیں۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر ہم پولیس والوں کے ساتھ مل کر مائی شپا کی اور مائی ماکھاں کی تلاش میں چل نکلے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ دونوں بلائیں جہلم سے آتی ہوئی ایک بس میں ہی مل گئیں۔ جونہی وہ لالہ موسیٰ کے اڈّے پر اتریں پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔ تھانے میں لا کر جب سپاہیوں نے اپنے خاص نسخے ان پر آزمائے تو معلوم ہوا کہ وہ کئی گھروں کو اسی طرح برباد کر چکی ہیں اور اپنے قبیلے کی بُہت ہی مالدار عورت سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی بیٹیوں کے پاس کئی کئی سیر سونے کے زیور موجود ہیں۔ روپے پیسے کی بھی انہیں کوئی کمی نہ تھی۔ اِن دونوں بوڑھیوں کے جوان لڑکے

عیش کرتے پھرتے تھے۔ ان کو بھی لالہ موسیٰ کے نواح سے گرفتار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان سب نے دو دو تین تین شادیاں کرر کھی تھیں۔ ریشمی کُرتے اور ریشمی تہمد باندھ کر وہ رانجھے بنے بھرتے تھے۔ ان کے قبضے سے بہُت سے نوٹ بر آمد ہوئے۔ مائی ماکھاں نے میری امّی جان کے تمام زیور اور وہ چودہ سو روپیہ پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس کے علاوہ بھی بہُت سا مال سونا اور قیمتی کپڑے پولیس نے ان کی بیٹیوں بہوؤں اور لڑکوں کے قبضے سے بر آمد کر لیے۔

تب ہمیں معلوم ہوا کہ وہ سادہ لوح عورتوں کو کس طرح اپنے ہتھکنڈے دکھا کر اپنا مطلب نکالتی تھیں۔ جس گھر میں وہ داخل ہوتیں وہاں اگر وہ دیکھتیں کہ گھر والی اکیلی ہے اور بچّے اور خاوند گھر میں نہیں ہیں تو ان میں سے مالی ماکھاں بی بی پاک دامن بن جاتی اور مائی شپا کی خود کو اُس بڑھیا کی مرید ظاہر کرتی۔ انہوں نے قرآن مجید کی کچھ کتابیں بھی یاد کرر کھی تھیں۔ جن کو مائی ماکھاں بڑی خوش الحانی کے ساتھ پڑھتی۔ گھر والوں کے حالات وہ پہلے ہی پاس پڑوس میں دو چار دن پھر پھرا کر معلوم کر لیتی تھیں۔ پھر گھر والی کو اپنے علم کے زور سے بتا دیتی تھیں کہ

اس کے اتنے بچّے ہیں، اتنے مر چکے ہیں، اتنے زندہ ہیں۔ اس کا خاوند فلاں بیماری میں مبتلا ہے یا اسے فلاں وقت ترقّی ملی تھی یا اُسے فلاں کام میں فائدہ ہو رہا ہے۔ یہ باتیں چونکہ بالعموم سچّی ہوتی تھیں اس لیے گھر والی سادہ لوح عورتیں اُن کے جال میں پھنس جاتی تھیں۔ پھر وہ تعویذ گنڈے کا چکّر چلا دیتیں۔ نقد مال کی امید ہوتی تو نوٹ دُگنے کرنے کا لالچ دے کر ساری رقم سامنے رکھوا لیتیں پھر گھر والی سے کہتیں کہ وہ باوضو ہو کر ان کے سامنے بیٹھے۔ وضو کے پانی کو بابرکت بنانے کے لیے وہ آبنوس کی خوبصورت لکڑی کا ٹکڑا پانی میں پھیرنے لگتیں۔ دراصل اس سوکھی لکڑی کے اندر وہ بے ہوشی کی دوا بھر کر رکھتی تھیں اس پانی میں جب وہ دوا حل ہو جاتی تو اس سے کُلی کرنے سے یا اس کا ایک قطرہ ناک میں ڈالنے سے گھر والی بالکل بے ہوش ہو جاتی۔ اس کی بے ہوشی کے دوران وہ دونوں بوڑھیاں گھر کا صفایا کر کے رفو چکر ہو جاتیں۔ آج اگر وہ ایسی واردات لاہور میں کرتی تھیں تو چند دن بعد وہ دوسری واردات راولپنڈی جا کر کرتی تھیں اور اس طرح وہ پولیس کی نظروں سے بھی محفوظ رہتی تھیں۔ وہ دونوں اپنے فن میں اتنی ماہر تھیں کہ اوّل تو انہیں دوسری بار پہچان لینا ہی ناممکن تھا۔ کیونکہ وہ جہاں سے

ایک بار مال اُڑاتی تھیں وہاں پھر دو دو سال تک نہ جاتی تھیں اور اُن کے ستم کا نشانہ چونکہ بالعموم پردہ دار عورتیں ہی بنتی تھیں جو بے چاری گھر کی چار دیواری سے بہت کم باہر نکلتی تھیں اس لیے ان کو پہچان لینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ تو اتفاقاً ایسا ہوا کہ میں نے ان کو ڈیوڑھی سے نکلتے دیکھ لیا تھا ورنہ میں بھی ہمیشہ سوچتا ہی رہتا کہ وہ کون تھیں۔۔۔ اور ہاں! وہ پیر صاحب وہ تو ایسے غائب ہوئے کہ اُن کا پتا کوششوں کے باوجود بھی نہ چل سکا۔ اصل میں انہوں نے اپنے خفیہ ٹھکانے ان عورتوں کو بھی نہیں بتائے ہوئے تھے۔

بہر حال ہمارے تمام کپڑے، سارے زیور اور پوری نقدی ہمیں چند دن بعد واپس مل گئی۔ میچ تو میں اس چکّر میں نہ کھیل سکا مگر ماسٹر صاحب کی مہربانی سے اتنا ضرور ہوا کہ ہمیں ہماری کھوئی ہوئی دولت مل گئی اور میری زندگی بھی بچ گئی۔ عدالت میں مقدمہ کئی دن تک چلتا رہا۔ مختلف شہروں سے لوگوں کو بُلا کر پولیس نے اُن کا مال واپس کیا۔ مائی شپا کی اور مائی ماکھاں کو دس دس سال قید بامشقّت کی

سزا دی گئی اور ان کے ساتھیوں کو پانچ پانچ سال قید سنائی گئی۔ میں خُوش تھا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ میچ نہیں تو نہ سہی اپنا مال تو واپس مل گیا۔

دو دوست

ہم دونوں ایک دوسرے کی بڑی عزّت کرتے تھے۔ میں انہیں شیخ صاحب کہتا تھا اور وہ مجھے خان صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ مگر محلّے میں ہماری عزّت نہ تھی۔ وجہ اس کی صرف ایک تھی کہ ہم ان دنوں کوڑی کوڑی کے محتاج ہو رہے تھے۔ شیخ صاحب سے میری دوستی جیل میں ہوئی تھی۔ وہ فریب دہی کے الزام میں دو سال کے لیے قید ہو چکے تھے۔ میں بھی آوارہ گردی کے الزام میں چھ ماہ کی سزا بھگت چکا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی دن جیل سے رہا ہوئے۔ ہمارے پاس اللہ کے دیے ہاتھ پاؤں تو تھے مگر جیبیں خالی تھیں۔ ہم نے ایک ٹھیکے دار کے پاس مزدوری شروع کر دی اور سوچا کہ کبھی نہ کبھی ہمارے دن بھی پھریں گئے۔ سرِ دست دو ڈھائی روپے کی دہاڑی ہی غنیمت معلوم ہوتی تھی۔

رہنے کے لیے ہم نے تاج پورہ میں ایک بیٹھک لے لی، مگر شیخ صاحب بالکل مطمئن نہ تھے۔ وہ کہتے تھے کہ آخر ہم کب تک یوں لوگوں کے مکان تعمیر کرتے

رہیں گے۔ میں کہتا کہ شیخ صاحب آپ کیا مکان تعمیر کر کے لوگوں کو دیں گے، یہی کیا کم ہے کہ ڈھائی روپے روز آپ کو مزدوری مل جاتی ہے۔ مگر وہ اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں کے گٹے دکھاتے اور کہتے "خان صاحب انصاف سے کہیے کیا یہ ہاتھ اس لیے پیدا کیے گئے تھے کہ ان سے میں سارا دن مٹی ڈھوتا رہوں۔ کوئی ترکیب لڑائیں تاکہ کچھ لمبا مال ہاتھ آئے۔ اس طرح تو اللہ قسم ہم پندرہ دن تک اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔" اور یہ کہتے ہوئے کئی بار اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے۔ مجھے ان پر بڑا ترس آتا تھا۔ ان کا بھاری بھرکم جثہ دیکھ کر میں کہتا۔

"شیخ صاحب آپ کو تو کسی بہت بڑی دُکان کی گدّی پر بیٹھنا چاہیئے تھا۔ حقّہ آپ کے سامنے ہوتا۔ نوکر کام کرتے رہتے اور آپ بیٹھ کر نوٹ گنا کرتے۔ اس ٹوکری مزدوری کے لیے تو آپ پیدا ہی نہیں کیے گئے۔"

اس پر وہ ٹھنڈی آہیں بھرتے۔ پانچ آنے دے کر سڑک کے کنارے بیٹھے کسی نجومی سے اپنی قسمت کا حال پوچھتے اور پھر کہتے۔

”خان صاحب، مال تو قسمت میں ہے مگر کوئی ترکیب لڑانا پڑے گی۔ واللہ کچھ تو سوچیے۔ ایسے کیسے چلے گا۔“

ہم دن رات روپیہ حاصل کرنے کی ترکیبیں سوچتے رہتے۔ دن کو ٹھیکے دار کے ہاں مزدوری کرتے اور رات کو بنگلے کے سگریٹ پی پی کر روپیہ پیدا کرنے کی تدبیریں سوچتے۔

ایک دن شیخ صاحب بڑے خوش خوش نظر آئے۔ میں نے پوچھا۔

”شیخ جی، آپ کو یہ میں آج خلافِ معمول اتنا خُوش کیوں دیکھ رہا ہوں۔“

وہ بولے۔

”خان صاحب میں نے ایک تدبیر سوچی ہے۔ اللہ قسم اگر تنگڑم ہو گئی تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔“

میں ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گیا تو معلوم ہوا کہ وہ سیٹھ نبی احمد کے لڑکے محسن کو اغوا کر کے سیٹھ سے پچاس ہزار روپیہ بٹورنا چاہتے ہیں۔ اس منصوبے کی جو

تفصیلات انہوں نے بتائیں وہ بڑی معقول اور بڑی خوش کُن تھیں۔ میں تو شیخ صاحب کا پہلے ہی مداح اور مرید تھا۔ فوراً اس نیک کام میں ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے تیار ہو گیا۔

شیخ صاحب کسی زمانے میں کسی امیر آدمی کے ہاں کار ڈرائیور رہے تھے۔ کار چلانا تو وہ جانتے ہی تھے۔

اگلے دن اُنہوں نے اپنے ٹھیکے دار کی کار ایک گھنٹے کے لیے مانگ لی کہ اپنے ایک عزیز کی شادی ہے۔ دلہا کو کار میں بٹھا کر ذرا لال کُرتی لے جانا ہے۔ ٹھیکیدار بھلا آدمی تھا مان گیا۔ کار لے کر ہم دونوں محسن کے سکول کے راستے میں جا کھڑے ہوئے۔ اس وقت چھٹی ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ ہم نے کار سڑک کے ایک طرف کھڑی کر دی اور اُس لڑکے کا انتظار کرنے لگے۔ کوئی بیس ایک منٹ بعد ہمیں محسن دُور سے بستہ گھماتا ہوا نظر آیا۔ ہم مسکین سی صورت بنا کر کار سے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ شیخ صاحب کی حالت اس وقت قابلِ دید تھی۔ اُنہوں

نے جیب سے ایک میلا کچیلا کاغذ نکالا۔ جو نہی وہ لڑکا قریب آیا۔ شیخ صاحب نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"میاں صاحبزادے ذرا اِدھر آنا۔"

"کیا ہے؟" لڑکے نے بڑے گستاخانہ انداز سے کہا۔ لڑکا خاصا صحت مند تھا۔ گورا چٹا سُرخی مائل رنگ، گھنے سیاہ بال، موٹی موٹی آنکھیں جن سے خون جھلکتا تھا۔ اسے دیکھ کر میں تو بہت ہی مرعوب ہوا۔

"بڑوں کا ادب کیا کرو بیٹے۔ ذرا یہ پتا تو پڑھ دو۔" شیخ صاحب نے بڑی نرمی سے وہ کاغذ کا پرزہ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا:

"تو کیا تُم پتا بھی نہیں پڑھ سکتے ہو۔ اتنے بڑے کیسے ہو گئے جو یہ پتا بھی نہیں پڑھ سکتے۔" لڑکے نے فخر سے سینہ پھُلاتے ہوئے کہا۔ اس کی کوٹھی وہاں سے تین فرلانگ دُور تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سورج ہمارے سروں پر چمک رہا تھا۔ گرمی سے ہم پسینے میں شرابور ہو چکے تھے۔

وہ لڑکا اٹھلاتا ہوا کار کے قریب آیا۔ کار کا دروازہ بند تھا۔ اس نے یونہی شرارت سے دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھول دیا اور پھر پاؤں کی ٹھوکر سے اسے بڑے زور سے بند کر کے بولا۔

”کار کس کی ہے؟“

”یہ۔۔۔ یہ ہمارے صاحب کی ہے۔ تم بیٹھو گے بیٹے۔ ہم تمہیں گھر پہنچا دیں گے۔“

”گھر جانے کی ہمیں جلدی نہیں ہوتی۔“

شیخ صاحب کو میں نے کنکھیوں سے دیکھا۔

”اچھا تو پھر چلو ہم تمہیں سیر کراتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ مجھے یقین تھا کہ خود ہی کار میں بیٹھ جائے گا کہ اس کی باتیں ہی ایسی تھیں مگر نہیں وہ ایک دم آگے بڑھنے لگا۔

ابھی وہ کار کے دوسرے سرے پر پہنچا ہی تھا کہ شیخ صاحب نے کار کا اگلا دروازہ کھول کر اسے زبردستی اندر دھکیل دیا اور دروازہ بند کر کے خود اس سے گتھم گتھا ہو گئے۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ میں بھی تیزی سے اندر گیا اور ہم دونوں اُسے پچھلی سیٹ پر بٹھانے کا جتن کرنے لگے۔ مگر وہ لڑکا تو کوئی بلا تھا۔ شیخ صاحب نے اس کی ٹانگیں پکڑ کر رسی سے باندھنے کی کوشش کی تو اس نے ایک دم شیخ صاحب کی ناک پر ایسی ٹکّر لگائی کہ ان کی بھدّی سی پکوڑا ناک سے خُون جاری ہو گیا۔

اس پر میں نے کھٹاک سے چاقو نکال کر اسے خوفزدہ کرنے کی کوشش کی تو وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا:

”میں تم دونوں کی ہڈّیاں توڑ دوں گا۔ جانتے ہو میں ’رابن ہُڈ‘ ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے بیٹھے بیٹھے ایک گھونسہ میرے جبڑے پر مار دیا۔ اس گھبراہٹ اور تگ و دو میں اچانک کھُلا چاقو اس کی کلائی میں لگ گیا جس سے خون رسنے لگا مگر

اس نے اُف تک نہ کی۔ خُون پُونچھ کر وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے ذرا سی بھی گھبراہٹ ظاہر نہ ہوتی تھی۔

شیخ صاحب نے کار سٹارٹ کر دی۔ تو بھی وہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔ ہماری توقع کے بالکل برعکس وہ لڑکا بڑا خونخوار ثابت ہو رہا تھا۔ میں کھُلا چاقو ہاتھ میں پکڑ کر اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ بڑے پُر اعتماد لہجے میں بولا:

"تم نے مجھے کار میں کیوں بٹھایا ہے۔ شور مچا دوں تو تم ابھی پکڑے جاؤ گے۔" تیرہ چودہ سال کا وہ لڑکا اپنی اس خود اعتمادی سے مجھے برابر خوفزدہ کر رہا تھا۔

"ہم تمہیں لمبی سیر کروا کے واپس لے آئیں گے۔ لیکن اگر تم نے شور مچایا تو ہم تمہیں یہیں ختم کر دیں گے۔" میں نے فیصلہ کُن انداز سے کہا۔

اس کے بعد وہ کچھ نہ بولا۔ ہم اسے راولپنڈی شہر سے دور کوہِ مری کی طرف کوہالہ کے قریب لے گئے۔ راستے میں ہم نے ایک جگہ کار روک کر اس کے منہ پر زبردستی رومال باندھا اور اس کے ہاتھ پیر رسّیوں میں جکڑ کر پچھلی سیٹ کے نیچے ڈال دیا۔ مگر اس کام میں ہمیں کافی چوٹیں سہنا پڑیں اور شیخ صاحب کا تو اس

نے بہت ہی بُرا حال کر دیا تھا۔ وہ تھکے ہوئے بھینسے کی طرح ہانپتے ہوئے کار چلانے لگے۔

ایک ویران مقام پر ہم نے اسے کار سے نکالا اور پہاڑ پر گھنے جنگل میں جا گھسے۔ وہاں ایک غار سی بنی ہوئی تھی۔ ہم نے اس لڑکے کو وہاں ڈال دیا۔ شیخ صاحب بولے۔ ”خان صاحب اب میں ٹھیکیدار کو کار واپس کر آتا ہوں اور سیٹھ نبی احمد کے نام چٹھی بھی ڈاک میں ڈال آؤں گا کہ اگر اسے اپنے بیٹے کی ضرورت ہے تو وہ پچاس ہزار روپے لے کر بارہ تاریخ کی رات کو کوہالہ پہنچ جائے۔ اگر اس نے پولیس کو خبر کر دی تو ہم اس کے بیٹے کو قتل کر دیں گے۔“

”مگر شیخ صاحب وہ سیٹھ اگر روپیہ لایا بھی تو اس سے کس طرح وصول کریں گے۔ ظاہر ہے کہ وہ پولیس کے بغیر تو نہیں آئے گا۔“

”پولیس آئی تو ہم روپیہ نہیں لیں گے اور اگر وہ خود ہی روپیہ لے کر آیا اور اس کی نیّت نیک ہوئی تو میں خُود اس سے مل کر روپے لے لوں گا۔ کھا تو نہیں لے گا وہ

مجھے۔ میں خط میں اُسے بتادوں گا کہ ہم اسے کس جگہ مل سکتے ہیں۔" شیخ صاحب نے کہا۔

"اچھا جی جیسے آپ کی مرضی میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ صرف سات دن کا راشن لے کر ہم آئے ہیں۔ اگر زیادہ دن گزر گئے تو ہم بھُوکے مر جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ میں ٹھیکیدار سے شادی کے اخراجات کے لیے سو روپیہ ادھار لے چکا ہوں۔" شیخ صاحب نے کہا۔

میں نے کار سے برتن اور آٹا اور دوسرا سامان نکال کر اس غار میں پہنچا دیا اور شیخ صاحب شہر واپس چلے گئے۔

لڑکا ابھی تک غار کے اندر بندھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر سے رومال کھول دیا تو وہ گندی گالیاں بکنے لگا۔ ہم دراصل اس پر کوئی سختی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے کہ اُس نے ہمارا کیا بگاڑا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس پر سختی کرتے

ہوئے ویسے بھی ہم خوفزدہ تھے۔ کیونکہ وہ لڑکا بڑا ہی خونخوار نظر آتا تھا۔ اس کی گالیاں سُن کر میں مسکرا کر رہ گیا۔

"تمہیں گھر یاد آ رہا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"گھر کا کیا ہے۔ میں کسی وقت بھی گھر جا سکتا ہوں۔ مگر یہ جگہ کونسی ہے۔" وہ بولا۔ میرا خیال تھا کہ وہ روئے گا، چیخے چلّائے گا مگر اس کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہیں تھا اور اور ہم ایسے معاملوں میں بالکل اناڑی تھے کہ لڑکوں کو کس طرح قابو کیا جا سکتا ہے۔ ہر قدم پر ہماری ناتجربہ کاری ظاہر ہوتی تھی۔

"ہم کوہ مری سے آگے آ چکے ہیں اور اب چند دن اس جنگل میں گزاریں گے۔ تم ڈرو گے تو نہیں؟"

"ابے مونچھ الاسلام۔ تو مجھے ڈرانا بھی چاہے تو میں نہیں ڈر سکتا۔ بیٹے تو خود ہی مُجھ سے خوفزدہ ہے جو یوں میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر بیٹھا ہے۔" اس نے بے خوف لہجے میں کہا۔ جنگل کا ماحول بڑا ہی ہیبت ناک تھا۔ خود مجھے بھی وہاں ہول

آتا تھا مگر اس لڑکے پر قطعاً کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ الٹا اُسے مذاق سوجھ رہا تھا۔ میری مونچھوں کی نسبت سے وہ مجھے مونچھ الاسلام کا خطاب دے رہا تھا۔

"ارے تو کس دھات کا بنا ہوا ہے۔ پتا ہے تجھے اغوا کر کے لے آئے ہیں۔ جب تک تیرا باپ ہمیں پچاس ہزار روپیہ نہیں دے گا ہم تمھیں یہیں قید کر رکھیں گے۔" میں نے اُسے پھر ڈرانے کی کوشش کی۔

"اچھا تو یہ بات تھی۔ ارے مونچھ الاسلام تو نے یہ بات مُجھے پہلے ہی کیوں نہ بتا دی۔ وُہ موٹا گیدڑ اب میرے ابّا جان سے روپیہ لینے گیا ہو گا؟" وہ بولا:

"ہاں وہ گیا تو ہے۔ اگر کامیاب ہو گیا تو ٹھیک ہے ورنہ تمھاری خیر نہیں۔" میں نے کہا۔

"تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کیونکہ میں نے تمھارا کچھ نہیں بگاڑا اور بے فکر رہو۔ میں جب تک تمھیں روپیہ نہیں ملتا، تمھارے پاس ہی رہوں گا۔ میں خود گھر نہیں جانا چاہتا۔ وہاں ہر روز ابّا جان مجھے سکول بھیج دیتے ہیں۔ صُبح صُبح اُٹھ کر نہانا پڑتا ہے۔ سکول میں استاد مارتے ہیں۔ گھر کے لیے کام دے دیتے ہیں۔ میں تو

اس زندگی سے تنگ آیا ہوا تھا۔ یہاں کا موسم بُہت اچھا ہے۔ اب ہم یہیں رہا کریں گے۔ خدا کرے ابّا جان اس موٹے گیدڑ کو پچاس ہزار روپے دے دیں تو پھر میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہا کروں گا۔" وہ بولا۔

"لاحول ولا قوۃ۔"

میں نے اپنے دل میں شرمندہ ہو کر سوچا کہ یہ ہم کسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ اس لڑکے پر تو ذرّہ بھر بھی رُعب نہیں پڑتا۔

"اگر تمہارے ابّا نے روپیہ نہ دیا تو ہم تمہیں ہر روز مارا کریں گے۔" میں نے پھر کہا۔

"ابے مونچھ منہ دھو کر رکھ ذرا۔ یہ میرے ہاتھ پاؤں تو کھول۔ دیکھ تیری کیسی ٹھکائی کرتا ہوں۔ منہ دھو کر رکھ بیٹے یہ دھونس کسی اور کو دینا۔ ابّا جان روپیہ نہیں دیں گے تو میرا کیا قصور ہو گا اس میں، بولتا کیوں نہیں بے چڑے!" وہ میرا مُنہ چڑا کر بولا۔

"ابے دیکھ اگر تو میرا نام بگاڑ تا رہا تو یاد رکھ اچھا نہ ہو گا۔ میرا نام خان صاحب ہے۔ بس تو مجھے خان صاحب کہا کر اور میرے ساتھی کو شیخ صاحب۔ سمجھا کہ نہیں۔"

"اچھا اچھا وہ موٹا گیدڑ شیخ صاحب اور تو خان صاحب ہے۔ واہ واہ کیا کہنے ہیں۔ ابے مونچھ تجھے تو جیل میں ہونا چاہیے تھا۔ تیری شکل ہی جیب کتروں جیسی ہے۔ بڑا آیا کہیں کا خان صاحب۔ تیر نہ کمان، بے باپ کے خان۔" وہ پھر میرا منہ چڑا کر عجیب انداز سے مسکرایا۔ میں تو اس کی اس بات پر بالکل ہی چڑ گیا۔

"اچھا تو بکواس کرتا رہ بیٹھ کر۔ میں روٹیاں پکانے کے لیے آگ کا بندوبست کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ابے مونچھ الاسلام، تو ناراض ہو گیا۔ ہم آج سے تمہیں ماموں جان کہہ دیا کریں گے۔ لے اب خوش ہے نا تو۔" وہ پھر زیرِ لب مسکرایا "ہت تیرے ماموں کی ایسی تیسی۔ لعنت ہے اس دن کے جس دن تو پیدا ہوا تھا۔ میں تیرا ماموں کس رشتے سے ہوا بے مینڈھے۔" میں نے بہت زیادہ تپ کر کہا۔

"تو یہ بات بھی تجھے پسند نہیں۔ یہ تو بڑی عزت کی بات ہے پیارے مونچھ پُونچھ۔ اچھا تو پھر ہم تمہیں خان صاحب ہی کہا کریں گے۔ آج سے ہماری تمہاری دوستی پکی ہو گئی۔ بس تم آج ذرا یہ ہاتھ پاؤں کھول دو۔ خدا کی قسم درد ہونے لگا ہے۔ وعدہ رہا کہ ہم کہیں نہیں بھاگیں گے اور پھر ماموں جان میں تو خود یہاں رہنا چاہتا ہوں۔ خدا کرے ابّا جان اس میلے گیدڑ کو پچاس ہزار روپیہ دے دیں مگر یار مونچھ یہ رقم کچھ زیادہ نہیں ہے۔"

"ابے پھر تو نے میرا نام بگاڑا۔ میں نے غصّے سے کہا۔

"اچھا بھئی غلطی ہوئی مگر یہ تمہاری مونچھیں ہی ایسی ہیں کہ۔۔۔ کہ۔۔۔ اچھا خیر تو کیا تم اپنا مطالبہ ذرا کم نہیں کر سکتے۔ ویسے تو ابّا جان کے پاس میں نے سنا ہے کروڑوں روپے ہیں مگر وہ میری خاطر اتنا روپیہ نہیں دیں گے۔ از کم مجھے تو بالکل اُمید نہیں ہے"

"کیوں ایسی کیا بات ہے۔ لوگ اولاد کے لیے جان دے دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

”دے دیتے ہوں گے جان بھی مگر۔۔۔ مگر میرے اپنے ابّا جان ایسے نہیں ہیں۔ وہ تو میرے لیے زیادہ سے زیادہ ایک سو روپیہ دے سکتے ہیں۔“

”ایک سو روپیہ۔ کیا مطلب؟ یعنی تمہاری قیمت گھر میں صرف ایک سو روپیہ ہو گی؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”نہیں یہ بات نہیں ہے جناب مونچھ، نہیں نہیں جناب خان صاحب، مگر وہ وہ مجھے کچھ اچھا نہیں سمجھتے۔ بس ہر وقت ڈانٹتے رہتے ہیں۔“

”یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ سب بچوں کے باپ ڈانٹا کرتے ہیں۔ شیخ صاحب کا مطالبہ وہ ضرور مان لیں گے اولاد کس کو پیاری نہیں ہوتی۔ اچھا تم یہ بتاؤ اور وعدہ کرو کہ یہاں سے بھاگو گے تو نہیں؟“ میں نے کہا۔ ”نہیں بھئی ماموں جان آپ کے سر کی قسم ہم خود یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ماسٹر کہتے ہیں کہ رابن ہڈ ایسے ہی جنگلوں میں بہادری کے کارنامے دکھایا کرتا تھا۔ ہم بھی یہاں اس جنگل کے رابن ہڈ بن جائیں گے۔ تیر کمان بنا کر شکار کھیلیں گے۔ شیروں کی پیٹھ پر

سوار ہو کر ہرن مارا کریں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم سے اسکول کی لعنت چھوٹی۔ میں تو آپ کا زندگی بھر ساتھ دینے کو تیار ہوں۔" وہ بڑے جوش سے بولا۔

حد ہو گئی۔ لڑکا تھا کہ آفت کا پرکالہ تھا۔ ایسی ایسی باتیں کرتا تھا کہ میری عقل دنگ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی عمر بہت زیادہ ہے۔ مگر تیرہ یا چودہ سال سے زیادہ اس کی عمر ہرگز نہ ہو گی۔ البتہ ایک بات کا مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بھاگنے کے موڈ میں بالکل نہیں ہے۔ اس لیے میں نے اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔ وہ آہستہ آہستہ اُٹھا اور ایک بھرپور انگڑائی لے کر بولا: ہمیں بڑی بھُوک لگی ہے ماموں جان۔ اب تم کچھ پیٹ پوجا کا بندوبست کرو۔ آخر ہم تمہارے مہمان ہیں۔"

"ہاں ہاں کرتے ہیں بندوبست مگر دیکھ لے پھر تو نے مجھے ماموں جان کہا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"اچھا اچھا اب تم تجھے سچّے دل سے خان صاحب کہا کریں گے مگر یار تو مجھے پٹھان نظر نہیں آتا۔ وہ تو بڑے اونچے لمبے گورے چٹے جوان ہوتے ہیں مگر تُو تو ایک

مکّے کی مار بھی نہیں سہ سکتا، ڈھائی پسلیوں کا آدمی ہے۔ آ مجھ سے پنجا لڑا۔ اس جنگل کے بادشاہ رابن ہڈ سے پنجہ لڑانے کی ہمّت رکھتا ہے۔" اس نے اپنا پنجہ تیزی سے آگے بڑھا کر کچھ اس طرح کہا کہ میں ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

"ابے تو کوئی رشتے داری تو نہیں کرے گا مجھ سے، میں جولاہا ہوں یا پٹھان، تجھے اس سے کیا غرض۔ بس تو سیدھی طرح سے مجھے خان صاحب کہا کر، سمجھا کہ نہیں۔" میں نے اپنے چہرے پر سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بولا:

"تجھے واقعی جیل میں ہونا چاہیے تھا۔ تیری شکل ہی جیب کتروں جیسی ہے اور سارے جیب کترے بُزدل ہوتے ہیں۔" جونہی اس نے یہ بات کہی مجھے ایک دم طیش آ گیا اور میں نے چٹاخ سے ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ مگر وہ تھپڑ مارنا غضب ہو گیا۔ وہ ایک دم مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا۔ اس میں ہاتھی جیسی طاقت تھی۔ مجھے کمر سے پکڑ کر اس نے ایک دم پیچھے گرا لیا اور مجھ پر اندھا دھند گھونسے برسانے لگا۔ میں ویسے ہی دھان پان کمزور ہڈّی کا آدمی ہوں۔ اس کے گھونسوں

کی بارش سے بلبلا اُٹھا۔ اس کو الگ کرنے کی میں نے زبردست کوشش کی مگر وہ تو بپھرا ہوا سانڈ تھا اور میں چالیس کے لگ بھگ تھا۔ فاقہ زدہ آدمی جس نے جیل میں کڑی سزائیں بھگت کر اپنی صحت ہی برباد کر لی تھی۔ میں اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا۔

"کیوں بے مونچھ۔ پھر مارے گا طمانچہ میرے منہ پے۔ ابے ابے باپ کے خان، میں تیرے ساتھ نیکی کر رہا ہوں، تجھے ابّا جان سے پچاس ہزار روپیہ مل جائے اور تو مجھے ہی تھپڑ مارتا ہے۔"

"اچھا اچھا بھئی۔ اب نہیں ماروں گا۔ ہٹ جا پرے۔ خدا کے لیے اب پرے ہٹ، دیکھ میرے منہ پر بڑی چوٹ لگ گئی ہے۔" میں نے یہ ظاہر کرنے کی زبردست کوشش کی کہ میں اس کے گھونسوں کو مذاق سمجھ رہا ہوں۔ اس کا غصّہ اس عرصہ میں بُہت حد تک کم ہو چکا تھا۔ وہ میرے سینے سے اُتر کر ہانپتا ہوا الگ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ میں کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا اٹھ بیٹھا۔ میں

ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کے گھونسوں سے میں نے درد محسوس کیا تھا یا مجھے کوئی شکایت تھی۔ جب ذرا میرا دم درست ہوا تو میں نے کہا۔

"چل ہے اب ذرا لکڑیاں اکٹھی کر لا۔ ہم کھانا پکاتے ہیں۔ خبر دار جو اب مجھ سے کشتی لڑی۔ جا مجھ اب شرافت سے لکڑیاں لا۔" "مگر پانی کہاں سے آئے گا؟" وہ بولا۔

"پانی میں نیچے جا کر اس چشمے سے لے آؤں گا جو ہم راستے میں دیکھ آئے ہیں۔" میں نے درد کی ٹیس کو ضبط کرتے ہوئے کہا جو مجھے اپنی کنپٹی پہ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اسی وقت جنگل میں سے لکڑیاں لانے چلا گیا۔ اس عرصہ میں میں نے چشمے سے پانی لا کر آٹا گوندھ لیا۔ جب وہ آیا تو اس کے سر پر لکڑیوں کا بُہت بڑا گٹھا تھا اور وہ مُسکراتا ہوا یوں آیا تھا جیسے اس کی ساری عمر ہی لکڑیاں ڈھونڈتے گزرتی ہے۔ میں نے پتھروں کا چولھا بنا کر اس پر توا رکھا اور روٹیاں پکانے لگا۔ مجھے یوں مصروف دیکھ کر وہ بولا:

”بھئی مونچھل۔۔۔۔ ارے نہیں نہیں۔ بھئی خان صاحب تم تو روٹیاں بُہت اچھی پکا لیتے ہو۔ کہیں باورچی وغیرہ تو نہیں رہے۔“

”تجھے باتیں آتی ہیں بیٹا۔ آج تو میں نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ لیکن پھر کبھی تم نے یوں گتھم گتھا ہونے کی کوشش کی تو یاد رکھو اچھا نہ ہو گا۔“

”اچھا تو تم ابھی تک ناراض ہو ہم سے۔ لو بھئی ہم تم سے معافی مانگ لیتے ہیں مگر یار وہ تمہارا موٹا گیدڑ کرے گا کیا۔ کہیں اسے پولیس ولیس نہ پکڑ لے۔“ وہ بولا۔

”دیکھو پھر تم نے میرے دوست کا نام بگاڑا۔ ابے میں کہتا ہوں تو تمیز سے بات کیوں نہیں کرتا۔“ میں نے جل بُھن کر کہا۔ اس کی زبان تو قینچی کی طرح چلتی تھی۔ وہ بولا۔

”بھائی باورچی بات یہ ہے کہ تم لوگوں سے ذرا بے تکلّفی سی ہو گئی ہے۔ گھر کی بات ہے۔ مگر تم تو آپے سے باہر ہو جاتے ہو۔ روٹیوں میں نمک بھی ڈالا تھا کہ نہیں؟“

”ڈالا تھا، ڈالا تھا۔ اب ذرا زبان بند رکھو میں کچھ سوچ رہا ہوں۔“ میں نے اسے ڈانٹتے ہوتے کہا۔

”اچھا تم سوچا کرو، ہم روٹی کھاتے ہیں۔ واہ تو مرچیں بھی ڈال دی ہیں آٹے میں۔ بُہت خوب بھئی بڑی مزید ار روٹیاں ہیں۔ اپنا وہ بڈھا باورچی تو بالکل نکمّا ہے۔ میں واپس جا کر ابّا جان سے تمہاری سفارش کروں گا کہ اس نے میری بہت خدمت کی تھی اسے ہی باورچی رکھ لیں۔“

”خدا غارت کرے تجھے۔ ابے کوّے کی اولاد تو چپ نہیں بیٹھ سکتا۔“ میں نے جلتی ہوئی لکڑی چولھے سے نکال کر اسے ڈراتے ہوئے کہا۔ مگر اس نے ایک دم اُٹھ کر بوٹ کی ٹھوکر جو اس لکڑی کو ماری تو ایک انگارہ اڑ کر میرے پاؤں پر گر گیا۔ میں درد سے بلبلا اُٹھا۔ ایک دم میری جلد جَل گئی۔ انگارہ کوئی چھوٹا نہ تھا۔

”اُف تیرا بیڑا غرق تو کیوں میری جان دشمن ہو رہا ہے لعنتی کہیں کے۔“ میں چیخا۔ وہ بولا۔

"ارے ارے مونچھل۔۔۔ تیرا تو پاؤں جل گیا۔ اب دوا بھی تو یہاں کوئی نہیں۔ کیا کریں اب۔" جلن سے میں بے حال ہو گیا تھا مگر کر ہی کیا سکتا تھا۔ صبر شکر کر کے بیٹھ رہا۔

روٹیاں پکا کر میں نے اسے کھلائیں۔ اپنا دوزخ بھرنے کے بعد اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔

"اچھا بھئی مونچھل۔۔۔ میں ذرا جنگل میں ٹہل آؤں تم اتنے میں برتن وغیرہ صاف کرو۔ دیکھو گھبرانا نہیں میں ابھی آجاؤں گا۔" میں نے غصّے سے پھنکارتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھا تو وہ بڑی عیّاری سے مُسکراتا ہوا گھنے جنگل کی طرف چلا گیا۔

شام ہونے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ میں نے برتن سمیٹے اور فارغ ہو کر سگریٹ پینے لگا۔ مجھے شیخ صاحب کا بڑی شدّت سے انتظار تھا۔ میں اس بدمعاش سے خواہ مخواہ پِٹ گیا تھا۔ وہ تو ایسا گھُنّا ثابت ہوا تھا۔ ٹرٹر باتیں کیے جاتا تھا۔ ہاتھ بھر لمبی تو اس کی زبان تھی اور ہتھ چھُٹ ایسا کہ بات بے بات لڑنے مرنے کو تیّار رہتا تھا۔

میرے تو دل پر دماغ پر ایسا خوف طاری ہو چکا تھا کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ اُس وقت وہ جنگل کی طرف یوں نڈر ہو کر نکل گیا تھا جیسے وہ اس کے ابّا کی حویلی کا پائیں باغ ہو۔ میں دل سے دُعا مانگ رہا تھا کہ کوئی جنگلی جانور اس کی ٹانگ چبا ڈالے اور چیختا چلّاتا میرے پاس آئے۔ میں پھر اُسے پوچھوں کہ مونچھل۔۔۔۔ہوں کہ اُس کا باپ۔

سورج چھُپنے سے ذرا پہلے ایک تھیلا اُٹھائے شیخ صاحب واپس آئے۔ میں بڑا ہی پریشان بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بولے۔

''کیا بات ہے خان صاحب؟ خیر تو ہے۔ آپ تو بہت پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ لڑکا کہاں ہے؟''

''وہ صاحب زادہ صاحب جنگل کی سیر کو گئے ہیں۔ میں پریشان تو نہیں، میں تو اچھا بھلا ہوں۔'' میں نے بڑے ضبط سے کام لے کر کہا۔ مگر جی چاہتا تھا کہ میں بھی اُسے موٹا گیدڑ کہہ دوں کہ اُسی نے اس مصیبت کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا

جس کی وجہ سے میری اس بد معاش نے ایسی گت بنائی تھی کہ میں اب تک اپنا دکھتا بدن سہلا رہا تھا۔

"آپ نے اسے اکیلا کیوں جانے دیا۔ کہیں بھاگ ہی نہ جائے وہ۔ میں کہتا ہوں آپ نے اس کی رسّیاں کیوں کھولی تھیں؟" شیخ صاحب نے فکر مند ہو کر کہا۔
"مُجھے دراصل اُس پر رحم آ گیا تھا شیخ صاحب، رہی بھاگنے کی بات تو بے فکر رہیں، وہ بھاگنے والی شے نہیں۔ الٹا وہ ہمیں کنگلا کے چھوڑے گا۔" میں نے جل کر کہا۔

"ہمیں بھگا کے چھوڑے گا؟ کیا مطلب؟ یعنی خان صاحب آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ وہ آ جائے تو میں دیکھوں گا وہ کیا کہتا ہے۔ مگر مجھے تو اس کی واپسی کی کوئی امید نہیں۔ کب سے گیا ہوا ہے؟" شیخ صاحب نے کہا۔

"یہی کوئی پون ایک گھنٹہ ہوا ہو گا اُسے گئے ہوئے۔ مگر وہ آ جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ سُنائیں کیا کچھ لے کر آئے ہیں آپ؟" میں نے دوسرا سگریٹ سلگا کر کہا۔

”میں ٹھیکیدار کی کار واپس کر کے سیدھا ڈاک خانے گیا۔ وہاں جا کر میں نے سیٹھ نبی احمد کے نام خط بھجوایا کہ وہ اس اتوار کو بھلی نیّت سے پچاس ہزار روپے لے کر رات کے دس بجے کو ہالہ سے تین میل اوپر دریا کی دوسری طرف دھیر کوٹ کی سڑک پر پہنچ جائے اور پولیس کو ساتھ لانے کی تکلیف نہ کرے ورنہ اس کا لڑکا محسن اُسے زندگی بھر نہ مل سکے گا۔“ شیخ صاحب نے غار کے سامنے بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر کہا۔

”خدا آپ کی امیدیں پوری کرے شیخ صاحب۔ میں نے لڑکے سے بات کی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ وہ خود بھی اپنے باپ کو خط لکھنے پر تیار ہے کہ انہیں براہِ کرم پچاس ہزار روپیہ دے دیا جائے۔“ میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”یار خان صاحب آپ تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ وہ لڑکا بھلا کیا لکھ کر دے گا۔“ شیخ صاحب نے کہا۔

”یہی وہ لکھ دے گا کہ اگر سیٹھ صاحب اپنے بیٹے کی زندگی چاہتے ہیں تو روپیہ شیخ صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔“ میں نے پھر بڑی متانت سے کہا۔

"خیر یہ بھی دیکھا جائے گا۔ پہلے میرا یہ خط تو پہنچے اس اتوار تک سیٹھ روپیہ لے کر ننگے پاؤں دوڑ تا نہ آئے تو کہنا۔ اچھا کچھ کھانے کا بھی بندوبست ہے کہ نہیں۔ میں اپنے ساتھ دس سیر بھُنے ہوئے چنے لے آیا ہوں کہ بھُوک کا یہ اچھا علاج ہے۔" شیخ صاحب نے کہا۔

"یہ اچھا کیا آپ نے۔ ذرا د کھائیں تو کیسے ہیں میں چکھ کر دیکھوں۔" میں نے کہا۔

"یہ لیں جتنے جی چاہتے ہیں، مگر وہ لڑکا ابھی تک کیوں نہیں آیا؟" شیخ صاحب نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"آ جائے گا شیخ صاحب۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔" میں نے کہا اور شیخ صاحب کو اپنے ہاتھ کی پکی روٹیاں پیش کر کے ان کے سامنے پانی بھی رکھ دیا۔

سورج چھُپ رہا تھا جب وہ لڑکا سیٹیاں بجاتا ہوا خوش و خرم واپس آ گیا۔ اس کی جیبوں میں جنگلی بیر بھرے تھے اور ایک ہاتھ میں انڈے پکڑے ہوتے تھے۔

آتے ہی بولا:

”اچھا تو تمہارے شیخ صاحب آ گئے۔ واہ کیا کہنے ہیں ان کے۔ کیوں بھئی موٹے گیدڑ تم ہمارے ابّا سے ملے تو انہوں نے کیا جواب دیا۔“

”موٹے گیدڑ! یہ کیا بکواس ہے۔ میں موٹا گیدڑ ہوں، یہ بد تمیزی میں برداشت نہیں کروں گا لڑکے!“ شیخ صاحب نے چیخ کر کہا۔ لقمہ اُن کے گلے میں پھنس کر رہ گیا۔

”ابے مُونچھ بتاتا کیوں نہیں تو اسے کہ یہ ہی موٹا گیدڑ، ہمارے ابّا جان سے روپیہ لینے ہی گیا تھا تو واپس کیسے آ گیا۔ اسے وہاں پولیس نے کیوں نہیں پکڑا۔“ وہ لڑکا بہت ہی بے تکلفی سے بول رہا تھا۔ میں سر نیچے کیے بیٹھا تھا کہ اچھا ہے ذرا شیخ صاحب بھی اس برخوردار کا مزہ چکھ لیں۔

شیخ صاحب نے جب یہ باتیں سنیں تو وہ آگ بگولا ہو گئے اور روٹی چھوڑ کر اس کے پیچھے بھاگے۔ رات کا وقت تھا۔ چار سُو جنگلی جانوروں کی خوفناک آواز سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے آگ دھکا رکھی تھی جس کی روشنی کی وجہ سے جانور اس طرف نہیں آتے تھے۔ ایسے خوفناک وقت میں وہ لڑکا موٹا گیدڑ موٹا گیدڑ کا

نعرہ لگاتا ہوا گھنے جنگل کی طرف بھاگا۔ شیخ صاحب اس کے پیچھے تھے۔ میں ان دونوں کو واپس آنے کے لیے پُکارتا ہوا ٹارچ لے کر ان کے پیچھے بھاگا۔

وہ لڑکا ایک دم کہیں غائب ہو گیا۔ شیخ صاحب کوئی ایک فرلانگ اس کے پیچھے بھاگے ہوں گے کہ ان کی رفتار سست پڑ گئی۔ اتنے میں میں بھی ان کے پاس جا پہنچا۔ وہ بے چارے تھکے ہوئے بھینسے کی طرح ہانپ رہے تھے۔ مجھے ان پر بڑا ترس آیا مگر جب مجھے اپنی گت یاد آئی تو میں اندھیرے میں مسکرا کر رہ گیا۔ میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

”صبر سے کام لیں شیخ صاحب۔ ایسے معاملوں میں ایسی باتیں سُننا ہی پڑتی ہیں۔ یہ بچّہ ہے۔ اگر ہم نے اسے یوں ڈرا دیا تو وہ بھاگ جائے گا اُسے پیار سے باندھیں۔“

”اجی خاک ڈالیں ایسے پیار پر۔ اچھا بچہ ہے وہ۔ گز بھر لمبی تو اس کی زبان ہے۔ مینڈک کی طرح ٹرّا رہا تھا۔ میں تو اس کی ہڈّیاں توڑ دوں گا۔ وہ مجھے جانتا نہیں ہے۔ خدا کی قسم میں اس کا خون پی لوں کا گھونٹ گھونٹ کر کے، حد ہو گئی۔ یعنی

آپ کے سامنے وہ مجھے موٹا گیدڑ کہہ رہا تھا اور آپ ہیں کہ اس کی وکالت کر رہے ہیں۔" شیخ صاحب بہت زیادہ سیخ پا ہو رہے تھے۔

"میں ٹھیک عرض کر رہا ہوں، شیخ صاحب، اس سانپ کا منتر ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس بد معاش کو نام رکھنے میں ایسی مہارت حاصل ہے کہ بس دیکھتے رہیے۔ اس نے چھوٹتے ہی میرا نام مونچھ الاسلام رکھ دیا۔ آپ کے سامنے وہ مجھے اس نام سے پکار رہا تھا، اب میں کیا کرتا۔ اس کی زبان کاٹ لیتا۔ اس لیے میرے بھائی یہاں صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ آیئے واپس چلتے ہیں۔ وہ خود ہی آ جائے گا۔ رات بھیانک ہوتی جا رہی ہے، آیئے بھی۔" میں شیخ صاحب کو کھینچتا ہوا واپس چل دیا۔

ہم اپنی غار سے ادھ فرلانگ دور تھے۔ جنگل میں چاندنی چھن چھن کر درختوں کے نیچے لہریں بنا رہی تھی۔ ایک درخت کے نیچے سے ہم گزر رہے تھے۔ شیخ صاحب بلند آواز سے اول فول بکتے میرے پیچھے آ رہے تھے کہ اچانک وہ

زبردست چیخ مار کر رہ گئے۔ میں نے تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ اپنی گردن سہلا رہے تھے۔ ”کیا ہوا شیخ صاحب کیا ہوا؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

میری گردن میں اس درخت پر سے کوئی پتھر لگا ہے۔ آہ میری تو شاید ہڈّی ٹوٹ گئی ہے۔ خان صاحب یہاں شدید درد ہو رہا ہے۔ اُف میری توبہ یہ کیا چیز تھی ذرا دیکھیں تو۔“

میں نے ٹارچ کی روشنی سے اس درخت کے چھتر کی طرف جو دیکھا تو وہاں وہ لڑکا بیٹھا جھُول رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی دیکھ کر وہ بولا:

”دیکھا را ابن ہڈ کا حملہ۔ کیوں بے مونچھل۔ اپنے اس موٹے گیدڑ کو سمجھا لے۔ یہ جنگل میرا ہے۔ یہاں میرا راج ہے۔ کوئی دم نہیں مار سکتا۔ میرے سامنے۔“

”ہت تیرا بیڑا غرق۔ لعنت ہے تیری صورت پر۔ شیخ صاحب کو تو نے خواہ مخواہ زخمی کر دیا۔ اب نیچے بھی اُترے گا کہ نہیں۔“ میں نے غصّے سے پھنکتے ہوئے کہا۔ شیخ صاحب تو اس کی آواز سن کر بالکل ہی سُن ہو گئے تھے۔

"جب کہ یہ موٹا گیدڑ وعدہ نہیں کرتا کہ وہ خواہ مخواہ ہم سے نہیں لڑے گا اور رُعب نہیں جمائے گا ہم یہیں بیٹھے رہیں گے اور بھُوک ہڑتال کر دیں گے اس سے پوچھو اس کا کیا ارادہ ہے؟" وہ بولا۔

شیخ صاحب بڑی مشکل سے اپنی جگہ سے اُٹھے وہ ابھی کی گردن سہلا رہے تھے۔ شاید منکا ہی ٹوٹ چکا تھا۔ ان کی گردن سیدھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ بڑی بجھی ہوئی آواز سے بولے:

"لٹکا رہنے دیں پھانسی اس بدمعاش کو۔ چلیں ہم اپنی جگہ پر چلتے ہیں۔ آخر یہ میرے ہاتھ آئے گا۔ ایسا سبق دوں گا بچے کو کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔"

"ابھی تین پتھر اور بھی میرے پاس ہیں موٹے۔۔۔ یاد رکھ میں تیری کھوپڑی پھاڑ دوں گا۔ ماروں ایک اور۔" وہ پھر بولا۔ شیخ صاحب تو یہ سنتے ہی دوڑ کر اس درخت کے نیچے سے نکلے۔ اس پر اس لڑکے نے اتنے زور سے قہقہہ لگایا کہ میں خود بھی کانپ اُٹھا۔

ہم دونوں اپنی اپنی جگہ سوچتے ہوئے بڑی خاموشی سے اپنے مقام پر واپس آ گئے۔ شیخ صاحب اب تک بڑبڑا رہے تھے۔ میں نے ابھی تک ان کو اپنی اس گت کا حال نہیں سنایا تھا نہ سُنانا ہی چاہتا تھا۔ میں خوش تھا کہ اچھا ہوا اور اس موٹے گیدڑ سے بھی اس نے وہی سلوک کیا جس کی وجہ سے میں اپنے آپ پر لعنت بھیج رہا تھا۔

موسم بڑا خوشگوار تھا۔ سردی نہ تھی نہ گرمی۔ جہاں ہم نے اپنا ڈیرہ لگا رکھا تھا وہ جگہ باقی جنگل سے کافی اونچی تھی۔ میں نے وہاں بستر کھول کر زمین پر بچھا دیے۔ چارپائیوں کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ سرہانے پتھر رکھ کر ہم لیٹ گئے۔

"اس لڑکے نے تو مجھے حیران کر دیا ہے خان صاحب۔ میرا تو خیال ہے کہ اسے پکڑ کر خوب ماریں۔ اتنا ماریں کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔" شیخ صاحب نے کافی دیر بعد کہا۔

"اگر موقع ملے تو ایسا کر دیکھیں۔ میں تو اس پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے سخت خوف محسوس کرتا ہوں۔" میں نے بڑی بے دلی سے یہ الفاظ کہے ہی تھے کہ اس لڑکے

کی آواز آئی۔ ”ابے او مونچھل میرے لیے بھی تم کوئی بستر لائے ہو کہ نہیں۔“ کچھ فاصلے پر کھڑا وہ ہمیں پکار رہا تھا۔

”ہاں بیٹے، تمہارے لیے تو ہم نے پہلے سے ہی انتظام کر رکھا تھا۔ یہ تیسرا بستر تمہارا ہے۔ اب تم آکر لیٹ جاؤ۔“ میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ وہ میرا نام بگاڑنے سے باز نہیں آتا تھا۔ پھر میں کب تک اس پر بگڑتا رہتا۔ ہماری ہمّت ہی نہیں پڑتی تھی کہ ہم اس پر پھر ہاتھ اُٹھائیں۔

وہ ہمارے پاس آیا بھی مگر اس نے بستر ہمارے پاس نہ بچھایا بلکہ کپڑے اُٹھا کر کچھ فاصلے پر جگہ صاف کر کے لیٹ گیا۔ اس رات تھکن کی وجہ سے مجھے اور شیخ صاحب کو اتنی گہری نیند آئی کہ معلوم بھی نہ ہو سکا کہ رات کس طرح گزری اور صبح کیسے ہو گئی۔

مگر جب ہم جاگے تم وہ لڑکا وہاں موجود نہ تھا اور میرا وہ چاقو بھی غائب تھا جو میں تکیے کے نیچے رکھ کر سویا تھا۔ شیخ صاحب کے پاس بھی ایک خنجر تھا وہ بھی غائب تھا۔ میں نے شیخ صاحب کو اپنے نقصان کی تفصیل بتائی تو وہ بولے۔

”خان صاحب، اس کا پتا کریں کہیں وہ بدمعاش بھاگ ہی نہ گیا ہو۔“

”میں نے کہا بھی تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیں مگر آپ تو خدا جانے کیا سوچتے رہتے ہیں۔ وہ میرا خنجر بھی لے گیا ہے اور وہ بٹوا بھی غائب ہے جس میں ہماری جمع پونجی تھی۔“

”کتنے روپے تھے اس میں؟“ میں نے تیزی سے پوچھا کہ اس جنگل میں ہمیں روز مرّہ کی ضروریات کے لیے روپے کی بے حد ضرورت تھی۔

”ایک سو پینتیس روپے تھے اس میں۔“ شیخ صاحب نے اپنا بستر سمیٹ کر کہا۔

ہم دونوں جلدی سے اٹھے اور اس کی تلاش میں چل نکلے، کوئی ایک گھنٹہ تک ہم اِدھر اُدھر آوارہ پھرنے کے بعد مایوس ہو کر اپنے اڈّے کی طرف لوٹے۔ اس کا ہمیں کہیں بھی کوئی نشان نہ ملا تھا۔ شیخ صاحب بہت زیادہ پریشان تھے۔ بولے: ”اگر وہ ایک آدھ گھنٹے تک ہمیں نہ ملا تو فوراً یہ جگہ چھوڑ دیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ شہر جا کر پولیس لے آئے۔“

وہ اپنی جگہ سچّے تھے۔ ہم سے بڑی سخت نادانی ہو چکی تھی۔ اسی شش و پنج میں جب ہم غار کے قریب پہنچے تو یہ دیکھ کر ہماری جان میں جان آئی کہ وہ لڑکا ہمارے سامنے بیٹھا تھا۔ چاقو اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ کوئی جانور کاٹ رہا تھا۔ ہم قریب پہنچے تو وہ بولا:

"ابے او مونچھل دیکھ تیرے لیے جل مرغ لایا ہوں۔"

شیخ صاحب اُسے مارنے کے لیے آگے بڑھنے تو میں نے انہیں بڑی مشکل سے روکا۔ اس پر وہ پھٹ پڑے۔ بولے:

"خان صاحب اس بد معاش سے پوچھو یہ کہاں سے آیا ہے اور وہ میرا بٹوہ اس نے کہاں رکھا ہے۔ اگر اس نے بٹوہ واپس نہ کیا تو میں اس کی کھال اُدھیڑ دوں گا۔"

وہ لڑکا یہ بات سن کر اُٹھ کھڑا ہوا چاقو اس کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ بڑے عجیب انداز سے مُسکراتا ہوا بولا۔

”ابے موٹے ذرا اپنا منہ تو دیکھ۔ تو میری کھال اُدھیرے گا جو خود پولیس سے ڈر کر یہاں چھپا بیٹھا ہے۔ یہ میری مہربانی ہے کہ میں آج تک بھاگا نہیں۔ ورنہ بڑا وقت تھا میرے پاس یہ رہا تیرا بٹوہ۔ کمینے تو مجھے چور سمجھتا ہے۔ یہ بٹوا میں نے اُدھر پتھروں پر پڑا پایا تھا۔ یہ لے سنبھال کے رکھ اس رقم کو تیرے کفن دفن کے کام آئے گی۔“

یہ کہہ کر اس نے بڑے جوش سے وہ بٹوا کھٹاک سے شیخ صاحب کے منہ پر دے مارا۔

ہم دونوں ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئے۔ مگر پھر میں نے جرأت کر کے کہا۔

”مگر وہ تم نے چاقو اور خنجر کیوں اُٹھائے تھے۔“

”یہ دونوں چیزیں اب میرے پاس رہیں گی۔ اگر تم لوگوں نے شرافت نہ دکھائی تو میں ان سے کام لے لوں گا۔ میں تو یہ دونوں چیزیں شکار کے لیے لے کر گیا تھا۔“ وہ بولا:

"اور یہ جل مُرغ تم نے کہاں سے پکڑا۔" میں نے پوچھا۔

"یہ ایک جگہ آٹھ دس بیٹھے تھے۔ میں نے ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ کر ان پر خنجر مارا جو ایک کے پیٹ میں لگ گیا۔ باقی اُڑ گئے بس اُس کی گردن پر میں نے فوراً تکبیر پھیر دی۔" وہ پھر اطمینان سے بیٹھ کر گوشت کاٹنے لگا۔

اب ہم اس سے صلح کرنے پر مجبور ہو چکے تھے کیونکہ وہ ہمیں قدم قدم پر شکست دے رہا تھا۔ ہم ساری عمر بھی لگے رہتے تو بھی ایک مرغ نہ پکڑ سکتے اور جو باتیں وہ اس کم عمری میں کر سکتا تھا ہمیں عمر کے اس حصّے میں بھی نہ کرنا آتی تھیں۔

شیخ صاحب کا غصّہ بھی اب ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ اس کے پاس بڑھ کر مرغ کا گوشت بنانے لگے۔ میں نے آگ جلائی اور ہم سب نے بھون کر اسے خوب مزے لے لے کر کھایا۔



اتوار تک کا وقت گھڑیاں گن گن کر گزرا۔ اتوار کی شام کو شیخ صاحب اکیلے ہی دھیر کوٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جگہ اور مقام کا تعین وہ خود ہی کر چکے تھے۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس سازش میں وہ لڑکا خود ہم سے بہت زیادہ تعاون کر رہا تھا۔ وہ اس جنگل میں اتنا خوش تھا کہ وہاں سے جانے کے ذکر پر ناراض ہو جاتا تھا۔ کہتا تھا اب میں واپس نہیں جانا چاہتا۔ وہاں شہر میں کیا رکھا ہے۔ پھر وہی اسکول کا جھنجھٹ ہو گا۔ پھر وہی ماسٹر ہوں گے جو صبح شام ہماری ٹھکائی کر کے خوش ہوں گے۔"

شیخ صاحب پیدل ہی چل دیے۔ ساری رات وہ باہر رہے۔ ہم اپنے بستروں میں لمبی تان کر سوتے رہے۔ صبح سورج نکلنے کے بعد ہمیں دُور سے شیخ صاحب کی صورت نظر آئی۔ وہ تھوتھنی لٹکائے چلے آرہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کا بڑے تپاک سے استقبال کیا مگر وہ بُہت زیادہ رنجیدہ نظر آتے تھے۔ میں نے کہا:

"خیر باشد؟" بولے:

”خیر کہاں ہے خان صاحب۔ وُہ سیٹھ آیا ہی نہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ کیوں نہیں آیا۔ رات بارہ بجے تک میں وہاں چھپ کر اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہاں سے نہ کوئی چٹھی ملی نہ روپیہ۔ میرا تو خیال میرا خط کی اس تک نہیں پہنچا۔“

”آپ نے خط پر پتا تو ٹھیک لکھا تھا کہ نہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”اجی کمال کرتے ہیں آپ۔ اس کام کے لیے تو میں نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال رکھی ہے۔ میں پتا بھی ٹھیک نہ لکھتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ شیخ صاحب نے کہا۔ وہ بہت زیادہ تھکے ہارے نظر آتے تھے۔ میں نے کہا:

”آپ نے باقی رات کہاں گزاری۔“

”لعنت بھیجیں جی اس قصّے پر۔ کہیں سر چھپانے کو جگہ نہ مل سکی اور واپسی بالکل ناممکن تھی۔ آٹھ میل کا پیدل سفر رات تاریک راستہ ویران۔ میں تو وہیں ایک درخت کے نیچے پڑا سردی میں اکڑتا رہا۔“

”مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے، شیخ صاحب چلیں پہلے ماحضر تناول فرمالیں۔“ میں نے کہا۔

وہ سمجھ گئے کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ بس جل کر رہ گئے۔ بولے:

”آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے خان صاحب ذرا غور فرمائیں کہ وہ سیٹھ وہاں نہیں آیا۔ اس نے ہمارے خط کی کوئی پروا نہیں کی۔ اسے اپنی اولاد سے زیادہ اپنی دولت پیاری معلوم ہوتی ہے۔“

وہ لڑکا اب تک وہیں بیٹھا دور سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ جب ہم کافی دیر تک آگے نہ بڑھے تو وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہماری طرف آیا اور بولا:

”روپیہ ملا کہ نہیں؟“

”تمہارے ابّا نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔“ میں نے کہا۔ اس پر وہ خوب ہنسا، کافی دیر تک قہقہے لگاتا رہا۔

”ابے چپ بھی ہوگا کہ نہیں۔“ شیخ صاحب نے چلّا کر کہا۔

”میں اب نہیں ہوں۔ اب تم ہو موٹے گیدڑ۔ تمہارے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے، میرے ابّا اتنی آسانی سے روپیہ دینے لگیں تو دنوں میں ختم ہو جائے۔“

”سیٹھ کو تیرے جیسے نالائق کی پرواہوتی تو وہ ضرور ہمارے خط کا جواب دیتا۔“ میں نے چال چلی۔ یہ بات سُن کر وہ ایک دم بجھ سا گیا۔ اور اداس سی نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا واپس ہو گیا۔

”لڑکے کو میری اس بات سے صدمہ پہنچا ہے۔“ میں نے حیران ہو کر کہا۔

”بڑا گھنا بد معاش ہے، کیا سمجھتے ہو اسے۔ میرا ابھی یہی خیال ہے کہ سیٹھ دولت کو اولاد سے زیادہ عزیز سمجھتا ہے۔“ شیخ صاحب نے کہا اس کے بعد ہم اپنے اڈّے پر واپس آ گئے۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد شیخ صاحب کوہ مری چلے گئے۔ وہ سیٹھ کو ایک اور زور دار خط لکھنے ارادہ رکھتے تھے۔ وہ چلے گئے تو ہم دونوں جنگل میں بڑے اطمینان سے سیر و تفریح کرتے رہے۔ اس لڑکے نے کمال کا پھُرتیلا بدن پایا تھا اور دماغ تو اس کا اتنا تیز تھا کہ اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتا تھا۔ اس روز وہ دیر تک چشمے کے قریب چھُپ کر

بیٹھا رہا۔ وہاں کئی جانور پانی پینے کے لے آتے تھے۔ شام ہونے سے ذرا پہلے وہاں دو نیل گائیں پانی پینے کے لیے آئیں۔ اس لڑکے نے ایک بڑا سا رسّہ کہیں سے تلاش کر لیا تھا۔ وہ شاید کسی شکاری کا اس جنگل میں رہ گیا ہو گا۔ اور وہ اُس رسے کا ایک سرا درخت سے باندھ کر دوسرے کو کھلی کھسکنے والی گرہ دے کر وہاں بیٹھا تھا۔ مجھے اس کی اس حرکت پر ہنسی آرہی تھی۔ کئی بار میں اسے واپس چلنے کو کہہ چکا تھا مگر وہ اپنی بات کا دھنی تھا۔ جم کر وہاں بیٹھا رہا۔

وہ نیل گائیں پانی پی کر واپس جانے لگیں تو اس نے کچھ اتنی پھرتی اور سُرعت سے اُچھل کر وہ رسّہ پھینکا کہ ایک نیل گائے کا پورا سر اس کھلی گرہ میں پھنس کر گردن تک جا پہنچا۔ گرہ کھسکتی گئی اور حلقہ تنگ ہوتا گیا۔ جس کی وجہ سے وہ گائے اس درخت سے بندھ کر رہ گئی۔ دوسری گائے خوف زدہ ہو کر سرپٹ بھاگی۔ اس نے اتنی مہارت اور چابکدستی سے وہ گائے پکڑلی تھی کہ میں عش عش کر اُٹھا اور واہ واہ کرتا ہوا اس کی طرف دوڑا۔ رسّے کا دوسرا سرا درخت سے بندھا تھا۔ اور وہ گائے مسلسل اس رسّے کو توڑنے کے لیے زور لگا رہی تھی۔

لڑکا بالکل خاموش اور سنجیدہ رہا۔ اس کے چہرے پر ایسی متانت طاری تھی کہ میں حیرت زدہ سا رہ گیا۔ میری کسی بات کا اس نے جواب نہیں دیا۔ پتلون کی جیب سے اس نے شیخ صاحب کا لمبے پھل کا خنجر نکالا اور سنبھل سنبھل کر اس گائے کی طرف بڑھا جس کے نوکیلے سینگ دیکھ کر میں بے حد خوفزدہ ہو رہا تھا۔

"اس کے قریب مت جا، مُحسن دیکھ تو کتنی بپھری ہوئی ہے وہ۔" میں چلّایا مگر اس نے سُنی آن سُنی کر دی اور پہلو کی طرف سے ہو کر اس نے ایک دم پیٹ میں وہ خنجر بھونک دیا۔ ایک لحظے کے لیے تو جنگل میں اُس نیل گائے کی چیخوں نے تمام دوسری آوازیں دبا کر رکھ دیں۔ خنجر اس لڑکے کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ وہ گائے بڑے خوف ناک انداز سے اس پر حملہ کر رہی تھی۔ اب اُس نے میرا چاقو اپنے سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا اور رسّے کی آخری حد پر جا ٹھہرا۔ گائے تیزی سے دوڑتی ہوئی اس کی طرف بڑھی تو وہ طرح دے کر اس کے دوسرے پہلو کے ساتھ لگ گیا۔ ابھی اس نے اپنا سر موڑا ہی تھا کہ اس نے وہ چاقو اس کے پہلو میں

پوری قوّت سے گھونپ کر باہر کھینچ لیا۔ یہ زخم بہت ہی گہرا اور بڑا کاری لگا تھا۔ خُون کے فوّارے چھوٹ پڑے۔

وہ ساڑھے چار فٹ اُونچا گٹھے ہوئے بدن کا خوبصورت سا گورا چٹّا لڑکا میرے لیے اچنبھا بن گیا تھا۔ میں نے زندگی میں پھر کبھی ایسا منظر نہیں دیکھا۔ اس کے بالوں کی لٹیں اس کے شانے پر پڑی تھیں۔ ہونٹ بھنچے ہوئے، آنکھیں اس گائے پر جمی ہوئیں۔ اسے اس بات کے سوا کسی اور بات کا ہوش نہ تھا کہ اس نے اس نیل گائے کو ہر قیمت پر زیر کرلینا ہے اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہو چکا تھا۔ دوسرا زخم لگانے کے بعد وہ الگ ہو کر کھڑا ہو گیا۔

اس کی نظر مجھ سے ایک لحظہ کے لیے دوچار ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ یاد رکھو اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو میں تمہارے ساتھ بھی یہی سلوک کروں گا۔ اس خیال نے مجھے اور زیادہ خوفزدہ کر دیا کہ اگرچہ ہم اُسے اغوا کر کے لائے تھے۔ مگر اب یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے ہمیں باندھ رکھا ہو۔

نیل گائے کا خون زیادہ بہنے کی وجہ سے اب اس پر نقّاہت طاری ہوتی جارہی تھی اور وہ نڈھال ہو کر زمین پر بیٹھنے لگی۔ جونہی وہ نیچے بیٹھی لڑکے کی تیز طرار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ بولا:

"ابے او مونچھل اب آکر اسے ذبح کرلے ورنہ یہ حرام ہو جائے گی۔ جلدی آکر تکبیر پڑھ لے، ابے جلدی کر۔" اس نے یوں کہا جیسے وہ اپنے نوکر کو بُلا رہا تھا۔ میں تیزی سے گائے کی طرف بڑھا اور اس کے پیٹ میں دھنسا ہوا خنجر نکال کر گائے کو ذبح کرنے لگا۔

دن چھُپنے کے بعد شیخ صاحب ہمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے ادھر آ نکلے۔ اور ہمیں اس نیل گائے کا گوشت کاٹتے دیکھ کر اچنبھے میں رہ گئے۔ میں نے اُن کو اس معرکے کی ساری تفصیل بتائی تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس روز انہوں نے اس لڑکے کی ہمّت اور جرأت پر خوب واہ واہ کی کیونکہ گوشت شیخ صاحب کی کمزوری ہے اور وہ بھی نیل گائے کا گوشت۔ وہ تو اپنی کلفت بھُول کر ہمارا ہاتھ بٹانے لگے۔

”تو دوسرا خط ڈال آیا کہ نہیں۔“ اس لڑکے نے پھر اپنے مخصوص گستاخانہ انداز سے پوچھا جس پر شیخ صاحب پھر بھڑک اُٹھے اور کڑک کر بولے۔

”ابے تجھے کسی نے تمیز نہیں سکھائی گدھے، بڑوں کا ادب کیا کر۔“ اس پر وہ لڑکا ہنس کر بولا۔

”یار بات یہ ہے کہ تم دونوں کے لیے میرے پاس تمیز کا کوئی لفظ نہیں ہے۔ مجھے تم دونوں ہی جیب کترے معلوم ہوتے ہو۔ ایک موٹا ایک دبلا۔ اور جیب کترے، چوہے سے بھی زیادہ بزدل ہوتے ہیں۔“

”پھر تو لگا وہی بکواس کرنے۔ تو ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ ہم تجھ پر سختی کریں۔“ شیخ صاحب نے کہا۔

”وہ بھی کر دیکھ موٹے۔ یاد رکھ تیرے اندر اس نیل گائے سے زیادہ زور نہیں ہو سکتا۔“ وہ اکڑ کر بولا۔ چاقو اس کے سیدھے ہاتھ میں تھا اور ہلکی ہلکی چاندنی میں وہ ہمیں بڑا ہی خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔ یہ سب باتیں شاید ناقابلِ یقین معلوم ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس لڑکے نے ہمیں پوری طرح خوفزدہ کر رکھا تھا۔ وہ

اگر کہتا کہ میں واپس جا رہا ہوں تو مجھے یقین ہے کہ ہم اس کا راستہ روکنے کی جرأت نہ کرتے۔ نہ میں نہ شیخ صاحب، ہم دونوں کا تو اس نے پِتّا ہی مار دیا تھا۔

نیل گائے کا گوشت سمیٹ کر ہم اپنے اڈّے پر واپس آ گئے۔ وہاں میں نے نمک لگا کر اس گوشت کو آگ پر بھونا اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر کھانے لگے۔ اس سے زیادہ لذیذ گوشت میں نے پھر کبھی نہیں کھایا۔ جنگل کا سماں، رات کا پہلا پہر، اپنی آگ اپنا نمک، مفت کا گوشت۔ ایسی نعمتیں زندگی میں بار بار کہاں نصیب ہوتی ہیں۔ میں تو بار بار اس لڑکے کا شکریہ ادا کرتا رہا جس کی جرأت اور ہمّت کی بدولت ہمیں گوشت مل رہا تھا۔

شیخ صاحب دوسری چِٹھّی بھی ڈال آئے تھے اب کی بار انہوں نے سیٹھ کو کوہ مری پہنچ کر کسی جگہ پچاس ہزار روپیہ رکھ دینے کا حکم دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر جمعرات کو شام کے سات بجے تک کے روپیہ وہاں نہ پہنچا تو ہم اس کے بیٹے کو قتل کر دیں گے۔ یہ بڑا نیک ارادہ تھا جس کی کامیابی کا میں بھی دل سے خواہش مند تھا مگر میں سوچتا تھا کہ اس لڑکے کو قتل کون کرے گا۔ اپنے اندر تو میں اتنی ہمّت نہ

پاتا تھا اور شیخ صاحب بھی اسے دیکھ کر پہلے لال ہوتے تھے پھر کچھ سوچ کر پیلے ہونے لگتے تھے۔ تو میں نے سوچا کہ کیا اسے قتل کرنے کے لیے ہمیں شہر سے کوئی قصائی منگوانا پڑے گا۔ اپنے اس خدشے کا ذکر میں نے شیخ صاحب سے کیا تو وہ مجھ پر بہت بگڑے اور بولے۔

”خان صاحب، خدا کی قسم مجھے اگر کوئی ڈر ہے تو صرف یہ کہ یہ منصوبہ آپ کی بزدلی کی وجہ سے ناکام ہو گا ورنہ اس کی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں۔ آپ نے مخواہ مخواہ اس لڑکے کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔ ہاتھ بھر کا لونڈا ہے اور آپ مجھے اس سے ڈراتے رہتے ہیں۔“ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا تو وہ سخت جوش میں مبتلا تھے۔ میں نے کہا:

”مگر شیخ صاحب وہ نیل گائے کا حشر تو آپ نے دیکھا تھا اور اس صاحبزادے کے الفاظ بھی آپ کو یاد ہوں گے۔ اس وقت تو آپ کو کوئی جواب نہ سوجھا تھا۔ کمزور آسامی دیکھ کر آپ مجھ پر تو فوراً سوار ہو جاتے ہیں مگر میرا قصور تو بتائیں کہ کیا ہے؟“

اس پر وہ لاجواب سے ہو کر جیبوں میں سے سگریٹ تلاش کرنے لگے۔

جمعرات آئی تو وہ سہ پہر کو اس پہاڑ پر سے نیچے اُتر کر سڑک پر سے بس میں بیٹھ کر کوہ مری چلے گئے۔ اس رات بھی وہ واپس نہ آئے۔ دوسرے دن گیارہ بجے کے قریب وہ پھر منہ لٹکائے واپس آ گئے۔ لڑکا اس وقت جنگل میں گیا ہوا تھا۔ شیخ صاحب آ کر بڑی خاموشی سے دری پر بیٹھ گئے۔

"میں نے کہا یا حضرت یہ خاموشی کیسی۔ معلوم ہوتا ہے کل بھی سیٹھ نہیں پہنچ سکا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ اس پر وہ عجیب سی اداس نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے:

"یار خان صاحب۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ معاملہ کیا ہے۔ میں تو لال کُرتی بھی پھر آیا ہوں۔ نہ تو اس لڑکے کی گمشدگی کی اخبار میں اطلاع ہے نہ پولیس میں چرچا۔ تھانے کا ایک سپاہی میرا واقف ہے۔ وہ مجھے بازار میں مل گیا۔ میں نے اسے بھی پوچھا مگر معلوم ہوا کہ سیٹھ نے صرف لڑکے کی گمشدگی کی رپٹ وہاں درج

کروائی ہے اس کے بعد اس نے کوئی خبر نہیں لی۔ میں تو سخت حیران ہوں۔ یہ لڑکا سیٹھ کا بیٹا بھی ہے یا نہیں۔"

"اس میں تو شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ یہ لڑکا شیخ کا ہی بیٹا ہے مگر سیٹھ اس کے متعلق فکر مند کیوں نہیں ہوا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میں تیسری اور آخری چٹھّی آج سیٹھ کو بھجوا آیا ہوں کہ وہ اتوار کی شام کو سات بجے کوہ مری میں روپیہ لے کر پہنچ جائے اور پھر ہم ذمّہ دار نہ ہوں گے۔ میں نے اسے خط لکھنے کا پتہ بھی بتا دیا ہے کہ وہ چاہے تو پوسٹ ماسٹر کی معرفت خط بھی لکھ سکتا ہے۔" شیخ صاحب بولے۔

"یہ آپ نے بہت برا کیا۔ جب آپ خط لینے جائیں گے تو وہاں پولیس آپ کو دھر لے گی۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"میں کچّی گولیاں نہیں کھیلا ہوں خان صاحب۔ اپنا نام میں نے اُسے صحیح تھوڑی بتایا ہے۔ پھر اگر وہاں لیٹر بورڈ پر بغیر کسی پابندی کے مجھے وہ خط رکھا مل گیا تو لے لوں گا، ورنہ کسی سے نہیں پوچھوں گا۔ اگر سیٹھ نے پولیس کو ساتھ ملایا تو سیٹھ کا

خط باہر لوگوں کے خطوں میں نہ ہو گا بلکہ اس کے انتظار میں پولیس کے آدمی وہاں ہوں گے۔ جو کوئی وہ خط طلب کرے گا، اسے دھر لیں گے مگر میں ایسا کیوں کروں گا بھلا اور پھر جس جگہ میں نے سیٹھ کو پہنچنے کے لیے لکھا ہے، وہاں ایسی جگہ موجود ہے جہاں چھپ کر میں سارا منظر دیکھ سکوں گا کہ سیٹھ خود آیا ہے یا پولیس ساتھ لایا ہے یا کیا معاملہ ہے۔" شیخ صاحب نے تفصیل کے ساتھ مجھے ساری بات سمجھائی۔

"بس پھر ٹھیک ہے مگر میں کہتا ہوں کہ اگر سیٹھ اس اتوار کو بھی نہ آیا تو پھر کیا ہو گا۔ اس لڑکے کو قتل کرنے کا پھر کیا فائدہ، یہ تو ہمارا مقصد ہی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ معاملہ کافی ٹیڑھا ہے، مگر نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی بدبخت اپنی اولاد سے اس قدر لاپروا ہو جائے کہ وہ کوئی خبر ہی نہ لے۔" شیخ صاحب نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

آٹا اور نمک ہمارے پاس کافی تھا۔ گوشت اس لڑکے کی بدولت اس نیل گائے کا اتنا مل چکا تھا کہ ہمارے کافی دن نکل گئے۔ وہاں موسم سرد ہونے کی وجہ سے وہ گوشت خراب بھی نہ ہوا تھا۔ ہم نے ٹکڑوں کو نمک لگا کر رکھ لیا تھا۔ وہ ہم کھاتے رہے اور سگریٹ پیتے رہے۔

جمعہ کی شام کو ہمارے پاس پکانے کے لیے گوشت نہیں تھا۔ اس لیے مجبوراً آٹے میں نمک ڈال کر صرف روٹیوں پر گزارہ کرنا پڑا۔ حیرت یہ تھی کہ میری صحت اس فضا میں دن بدن اچھی ہو رہی تھی اور وہ لڑکا تو بہت ہی صحت مند اور چاق و چوبند ہو چکا تھا۔ وہ سیر بھر بھُنا ہوا گوشت صبح اور اتنا ہی شام کو کھا کر ہضم کر لیتا تھا۔ میری بھی بھوک چمک گئی تھی۔ البتّہ شیخ صاحب ہر وقت کُڑھنے اور پریشان رہنے کی وجہ سے بد ہضمی اور کھٹّے ڈکاروں کا شکار ہو رہے تھے۔ موٹاپے کی وجہ سے وہ زیادہ دوڑ دھوپ پسند نہ کرتے تھے۔ بس سارا دن بیٹھے سگریٹ پیتے رہتے۔ میں اور وہ لڑکا البتہ خوب لمبی لمبی سیر کرتے۔ مونچھل تو وہ مجھے اب بھی کہتا تھا مگر اب وہ دوستی کے رنگ میں بات کرتا تھا۔ اس کی طرف سے ہم بالکل

بے فکر تھے کہ اس کا تو گھر جانے کو جی ہی نہ چاہتا تھا۔ ایک دقّت تھی کہ کپڑے ہمارے بہت میلے ہو چکے تھے اور صابن ہم لے کر نہ آئے تھے۔ یہ تو اُمّید ہی نہ تھی کہ ہمیں وہاں اتنے دن تک رہنا پڑے گا۔ نہانے کا صابن البتّہ ہمارے پاس تھا اور ہم چشمے پر جا کر دوسرے چوتھے دن نہا لیتے تھے اور یوں ہمارے دن وہاں اس جنگل میں ہنسی خوشی گزرتے رہے۔

اتوار کی سہ پہر کو شیخ صاحب ایک بار پھر اس سیٹھ کو گالیاں دیتے ہوئے بڑی اُمّیدوں سے ساتھ وہاں سے روانہ ہوئے۔ میں نے انہیں گلے لگا کر اور لمبی لمبی دعائیں دے کر رخصت کیا۔ لڑکا ہماری اس تگ و دو اور دوڑ دھوپ سے بالکل لا تعلّق ہو چکا تھا۔ اس کے زہر میں بجھے ہوئے طنز سے گھبرا کر ہم نے اپنی ان پریشانیوں کا اس سے ذکر ہی ترک کر دیا تھا۔ فائدہ ہی کیا تھا۔ وہ اپنے حال میں مست تھا اور ہم اپنی فکروں میں غرق۔

اس رات بھی شیخ صاحب باہر رہے۔ اگلا دن بھی ان کے انتظار میں گزر گیا۔ وہ شام تک واپس نہ آئے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ خدا خیر کرے۔ ایسا نہ ہو کہیں وہ دھر

لیے گئے ہوں۔ میں نے اس خوف سے کہ کہیں پولیس ان کو ساتھ لے کر یہاں تک نہ آ پہنچے اپنا بوریا بستر سمیٹ کر رکھ لیا اور یہ ارادہ کر لیا کہ اگر وہ رات دس بجے تک واپس نہ آئے تو میں لڑکے کو ساتھ لے کر وہاں سے کہیں اور چلا جاؤں گا۔

چاندنی راتیں تھیں۔ سگرٹوں کے ڈبّے بھی کافی موجود تھے، البتّہ دو تین دن سے گوشت نہیں مل سکا تھا۔ اگرچہ وہ لڑکا سارا دن چشمے اور اس کے ارد گرد کے جنگل میں سر پھوڑتا پھرتا تھا مگر اسے کامیابی نہ ہو سکی تھی۔ ایسے میں خشک روٹی بھی غنیمت معلوم ہوتی تھی جو جان و تن کے رشتے کو قائم رکھے ہوئے تھی۔

رات کو دس بجے کے قریب دور سے چٹکی ہوئی چاندنی میں مجھے کوئی شخص جھاڑیوں سے بچتا بچاتا آگے بڑھتا نظر آیا۔ میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اپنے حضرت شیخ صاحب علیہ رحمت ہیں۔ میں انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے دوڑ پڑا۔

”بڑی راہ دکھائی یا حضرت آپ نے۔ کہیے کیا بنا؟ وہ سیٹھ آیا کہ نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں وہ بڑا بد معاش ثابت ہوا ہے۔ ہمارا بھی استاد نکلا وہ۔“ شیخ صاحب نے کہا۔

”کیا کہا اس نے؟ وہ آپ سے ملا بھی تھا کہ نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ خود کہاں ملنے آتا ہے ہم غریبوں سے۔ البتّہ اس نے دس پیسے خرچ کر کے ایک خط ضرور بھیج دیا ہے۔“ شیخ صاحب نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر مجھے بڑی بے دلی سے تھما دیا۔

”کیا لکھا ہے اس نے اور یہ خط کیسے آپ نے حاصل کیا؟“ میں نے پوچھا۔

میری یہ بات سن کر وہ ٹھہرے اور ایک پتھّر پر لیٹ گئے۔ بولے:

”یہ خط وہاں عام لوگوں کے خطوں میں پڑا تھا۔ میں گیا اور وہاں سے خط اٹھا کر ایک ہوٹل میں جا بیٹھا اور اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ بڑا ہی آسان کام تھا یہ۔“ شیخ صاحب نے لائیٹر جلا کر سگریٹ سلگایا۔

”مگر کیا لکھا ہے اس میں؟“ میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

”یار خان صاحب آپ کوئی اَن پڑھ تو نہیں ہیں۔ ماشا اللہ مڈل پاس ہیں۔ اسے کھول کر خود پڑھ لیں۔ خط اردو میں لکھا ہے۔“ شیخ صاحب نے کہا۔

”اچھا بھئی تو یہ لائٹر ذرا جلا کر رکھیں۔“ میں نے کہا۔

انہوں نے لائٹر جلایا اور میں خط پڑھنے لگا۔ سیٹھ نے لکھا تھا:

میرے مہربان دوستو!

آپ کی تینوں چھٹیاں موصول ہو چکی ہیں۔ جواب نہ دینا اخلاق سے بعید سمجھتا ہوں۔ اس لیے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ احوال یہ ہے کہ جس دن سے آپ میرے بیٹے مُحسن کو لے گئے ہیں میں آپ کو دعائیں دے رہا ہوں۔ وہ گھر جہاں ہر وقت دھما چوکڑی مچی رہتی تھی اور جس گھر میں میری کوئی شے محفوظ نہ رہتی تھی، جہاں ہر وقت چائے کے برتن قدِّ آدم آئینے اور اس قسم کی چیزیں میرے بیٹے کے ہاتھوں ٹوٹتی رہتی تھیں، وہ گھر اب جنّت کا نمونہ بن چکا ہے۔ نہ محسن یہاں

ہے، نہ اس کی وہ تنک مزاجی اور شرارتیں۔ ہر شے گھر میں قرینے سے لگی رہتی ہے۔ اب نہ کوئی نوکر زخمی ہوتا ہے، نہ ہمارے پالتو جانور ہی مرے ہوئے ملتے ہیں۔ باغ میں پھول بھی محفوظ ہو گئے۔ گلی محلے کے لوگوں کی آئے دن کی دھمکیوں سے بھی محفوظ ہو گئے۔ اب کوئی ہمسائی اپنے بچّے کا لہولہان سر لے کے ہمارے گھر لڑنے جھگڑنے نہیں آتی۔ خدا کا شکر ہے کہ اسکول سے بھی اب ایسی کوئی خبر نہیں آتی کہ آپ کے بیٹے نے آج فلاں کا سر پھوڑ دیا ہے اور فلاں چیز توڑ دی ہے۔ اتنا جرمانہ دیں اور اتنا ہرجانہ بھریں۔ اب خدا کے فضل سے میری کار بھی ٹھیک چل رہی ہے۔ جب سے محسن گیا ہے اس کے تمام شیشے سلامت ہیں۔ نہ اُس کے ٹائر ہی کٹتے ہیں نہ اسٹیئرنگ ہی ٹوٹا ہوا ملتا ہے۔ تو اس لحاظ سے میرے مہربان دوستو! یہ آپ کی بڑی مہربان ہے کہ آپ نے میرے سینے سے پہاڑ اِتنا بوجھ اتنی آسانی سے اتار دیا ہے۔ اس کے لیے میں آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ خدا آپ کو اس نیکی کی جزا دے۔ ایک محسن کی امّی ذرا پریشان رہتی ہے۔ سو ماؤں کی تو یہ عادت ہی ہوتی ہے۔ اس سے میں نہیں گھبراتا ہوں۔ باقی رہا آپ کے مطالبے کا معاملہ تو بھائی پچاس ہزار آپ مجھ سے مانگ رہے ہیں

اگر آپ اتنی رقم اپنے پلّے سے بھی دیں تو بھی میں لڑکا واپس لینے کو تیار نہیں ہوں۔ اگر آپ کو اس کے اخراجات کے سلسلے میں کوئی پریشانی ہے تو لکھیں۔ میں بڑی خوشی سے سو روپیہ مہینہ آپ کو بھجوادیا کروں گا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں فوراً لڑکا آپ سے واپس لے لوں تو اس کام کے عوض میں آپ سے پانچ ہزار روپے سے ایک پائی کم لینے کو تیار نہیں ہوں۔ وہ بھی محض اس وجہ سے کہ آپ مجھے کچھ ایسے خوش حال معلوم نہیں ہوتے۔ ورنہ میں آپ سے پچاس ہزار کا مطالبہ کرتا۔ رہی آپ کی اس دھمکی کی بات کہ آپ میرے بیٹے کو قتل کر دیں گے تو اس کی مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ میرا بیٹا ایسا ہے کہ وہ اپنی حفاظت خود کر سکتا ہے۔ اگر آپ اسے گولی نہ ماریں تو مجھے یقین ہے کہ کسی چھوٹے موٹے ہتھیار کے سامنے تو وہ ہتھیار نہیں ڈالے گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اسے قتل کرنے کا ارادہ آپ کر ہی نہیں سکتے کہ وہ آپ کے گروہ کا ایک بہت اچھا اور مفید رکن بن سکتا ہے۔

زیادہ تر آداب آپ کا مخلص

نبی احمد

”یار خان صاحب میرا تو ہاتھ بھی جلنے لگا۔ لائیٹر بہت تپ گیا ہے۔ اب پڑھ بھی چکو۔“ شیخ صاحب نے کہا۔

”پڑھ لیا ہے میں نے شیخ صاحب۔ یہ لیں اور اسے سنبھال کر رکھیں۔ یہ وہ تاریخی خط ہے جس کی کوئی قیمت نہیں لگا سکتا۔“ میں نے کہا۔

”کیا سمجھے! وہ سیٹھ ہمارا بھی اُستاد نکلا کہ نہیں۔“ شیخ صاحب نے کہا۔

”میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ وہ اس لڑکے سے پہلے ہی بیزار ہو گا جب ہی تو اس نے کوئی پروا نہیں کی۔“ میں بولا:

”مگر اب ہم کیا کریں؟“ شیخ صاحب نے کہا۔

”کرنا کیا ہے۔ اپنا ارادہ پورا کرو اور لڑکے کو قتل کر دو۔“ میں نے کہا:

’’خواہ مخواہ ہی! یار خان صاحب آپ کمال کرتے ہیں۔ مجھے تو اس بے چارے سے ہمدردی سی ہونے لگی ہے۔‘‘ شیخ صاحب بولے۔ ’’تو کیا اب آپ اس کی پرورش کریں گے۔ کیا ارادے ہیں آپ کے؟‘‘ میں نے کہا۔

’’میرا تو خیال ہے کہ میں۔۔۔ میں۔۔۔‘‘

’’ہاں یاں کہہ دیں۔ اب چھپانے کی کیا بات ہے اس میں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’کچھ نہیں یار خان صاحب۔ میں کہتا ہوں کہ میں اس لڑکے کو اپنا بیٹا کیوں نہ بنا لوں۔‘‘ شیخ صاحب نے سوچ کر کہا۔

’’خیال تو بڑا نیک ہے آپ کا مگر اس کا کیا بھروسہ کہ وہ سیٹھ آپ کو سو روپیہ مہینہ دیتا رہے گا۔‘‘

’’سیٹھ کو گولی مارو۔ میں خود اس کی پرورش کر سکتا ہوں۔‘‘

’’ڈھائی روپے روز کی ٹوکری مزدوری میں تو باپ بیٹے کا پیٹ نہیں پل سکتا۔‘‘

’’مگر کیا کریں۔ یہ تو بڑی مصیبت بن گئی ہمارے لیے۔‘‘

”میں کہتا ہوں شیخ صاحب۔ اسے یہیں ختم کر کے فاتحہ پڑھیں اور ہاتھ منہ دھو کر گھر چل دیں۔“ ”مگر اب ہم کس طرح اس عذاب سے جان بھی تو چھڑائیں کہ نہیں۔ کب تک یہاں جنگل میں پڑے رہیں گے۔ اب مقدّمہ تو ہم کرنے سے رہے کہ سیٹھ کا ہم نے لڑکا اغوا کیا مگر وہ ہمارے اس نیک کام کا عوضانہ مبلغ پچاس ہزار روپے دینے سے انکار کرتا ہے۔“ میں نے چڑ کر کہا۔

”اچھا چلیں آج کی رات تو یہیں گزارتے ہیں۔ صبح پھر سوچیں گے۔“ وہ بولے اور ہم اُٹھ کر اپنے اڈّے پر آ گئے۔ لڑکا سو چُکا تھا۔ ہم نے اُسے جگانے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور شام ہوتے ہی خود بھی پڑ کر سو رہے۔

صبح جب ہم جاگے تو خلافِ معمول وہ لڑکا ابھی تک سویا ہوا تھا۔ سورج بھی نکل آیا مگر اس نے لحاف سے منہ نہ نکالا۔ میں نے لحاف اٹھا کر دیکھا تو وہ ابھی تک سویا ہوا تھا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے جگانے لگا تو یہ دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوا کہ وہ تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔

”شیخ صاحب۔ لڑکے کو تو بڑا تیز بخار ہو چکا ہے۔“ ”ہائیں کیا کہتے ہیں آپ۔ یہ اسے بخار کیسے ہو گیا؟“ شیخ صاحب یہ کہہ کر دوڑتے ہوئے آئے اور لڑکے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ لحاف انہوں نے اس کے جسم سے اُٹھا دیا تو ہم یہ دیکھ کر سخت ہراساں ہوئے کہ اس کی بائیں ٹانگ گھٹنے تک سوجی ہوئی تھی۔

”ارے یہ کیا ہوا۔ اس کی ٹانگ کیسے سوج گئی۔“ میں نے کہا۔

”خان صاحب معلوم ہوتا ہے کوئی زہریلا کیڑا کاٹ گیا ہے اسے۔ خدا کی قسم اسے تو فوراً ہسپتال پہنچانا چاہیے۔ ہائے ہائے خدا اسے محفوظ رکھے۔ اس کی تو شرارتیں ہمیں زندگی بھر یاد رہیں گی۔ شیخ صاحب نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

”مگر یہاں ہسپتال کہاں ہے؟“ میں نے کہا۔

”آپ سب سامان باندھ لیں۔ ہم ابھی اسے کوہ مری لے جا کر ہسپتال میں داخل کروا دیں گے۔ جلدی کریں خان صاحب لڑکے کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ یا اللہ ہمارا گناہ معاف کر دے اور رسول کے صدقے اس بچے کی زندگی بچا لے۔“ شیخ صاحب ایک دم یوں ہو گئے جیسے ان کا اپنا بیٹا بسترِ مرگ پر پڑا ہو۔

میں نے اسی وقت اپنا سارا سامان باندھا۔ فالتو چیزیں وہیں پھینک دیں کہ پھر کسی ہم ایسے کے کام آئیں گی۔ ایک بڑا سا گٹھڑ بنا کر میں نے اپنے سر پر اُلٹایا اور اس لڑکے کو جگا کر شیخ صاحب نے کندھوں پر اُٹھالیا اور ہم تیزی سے نیچے اترنے لگے۔ شیخ صاحب کی حالت قابلِ دید تھی۔ کہاں تو وہ اکیلے ان جگہوں پر چلتے پھرتے دشواری محسوس کرتے تھے، کہاں اس روز وہ جوان گھوڑے کی سی پھرتی سے اس لڑکے کو اُٹھا کر لپکتے ہوئے نیچے اُترنے لگے۔

سڑک پر پہنچتے ہی ہمیں بس مل گئی اور ہم اس میں سوار ہو کر کوہ مری روانہ ہوئے۔ لڑکے پر غنودگی سی طاری تھی۔ اور اس کیڑے کا زہر اس کے خون میں تیزی سے سرایت کرتا جارہا تھا۔

سارا راستہ شیخ صاحب منہ ہی منہ میں خُدا سے اس لڑکے کی صحت کی دعائیں مانگتے گئے۔ ان کے دل میں سوئی ہوئی شفقت و محبّت کے چشمے اُبلنے لگے تھے۔ وہ اپنے پچاس ہزار مطالبے کو بھُول کر اس لڑکے کی صحت کی فکر میں گھلنے لگے تھے۔

کوہ مری پہنچ کر ہم نے سامان تو بسوں کے اڈے پر ایک چوکیدار کے حوالے کیا اور خود اس لڑکے کو لے کر ہسپتال بھاگے۔ ہر گھڑی اس بے چارے کی حالت بگڑتی جارہی تھی۔ ہسپتال پہنچ نے جب اسے ڈاکٹر کو دکھایا تو وہ بولا۔

”اسے تو سانپ نے ڈس لیا ہے مگر خُدا کے فضل سے بچ جائے گا۔ آپ ٹھیک وقت پر اسے لے آئے ہیں۔“

”اف میرے مولا۔ وہ سانپ تھا۔ پروردگار میری زندگی اس بچے کو عطا کر دے۔ اپنے کرم سے اسے صحت دے۔ مجھے بے شک آج ہی اس دنیا سے اُٹھا لے۔“ شیخ صاحب ڈاکٹر اور دوسرے لوگوں کی موجودگی سے بے پرواہو کر بے اختیار دعائیں مانگنے لگے۔ خود مجھے بھی بڑی پریشانی لاحق تھی مگر اتنی بھی نہیں جتنی کہ شیخ صاحب کو تھی۔ لڑکے کو ہسپتال پہنچا کر ہم سیدھے تار گھر گئے اور وہاں سے میں نے خود سیٹھ نبی احمد کو فون پر راولپنڈی میں یہ بتایا کہ ان کا لڑکا اس وقت فلاں ہسپتال میں داخل ہے۔ اسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ سیٹھ نبی احمد جن

کے خط سے بیٹے کے متعلق اتنی لاپروائی جھلکتی تھی، فون پر ہی ہائے ہائے کرنے لگا۔ وہ بولا:

”یہ کیا ہو گیا میرے بچے کو۔ اوہ ان ظالموں نے اسے کہاں سانپ کے بل پہ جا بٹھایا تھا۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔ بھائی خُدا تمہارا بھلا کرے۔“ میں نے اسے بتایا کہ میں نے ہسپتال میں اس کے لڑکے کو دیکھ کر پہچان لیا تھا اور یہ بھی کہا کہ میں بھی لال کُرتی کا رہنے والا ہوں۔ یہ ساری گفتگو کر کے میں نے فون بند کر دیا۔

شیخ صاحب میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اس لڑکے کے قصّے سے الگ ہو جانا چاہیے۔ خُدا اسے صحت دے تو بہتر نہ دے تو بہتر۔ سیٹھ خود یہاں آ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اب کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔ اب تو ہمیں یہ علاقہ چھوڑ کر پشاور چلے جانا چاہیے۔“ میں نے اپنے دوست کو مشورہ دیا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں خان صاحب مگر اس کی خیر خبر کیسے ہو گی؟“ شیخ صاحب نے کہا۔

”ہم کوئی ایک آدھ ہفتہ بعد ہسپتال سے پوچھ لیں گے فون کر کے یا خود آ کر مگر ابھی ہمیں یہاں سے ٹل جانا چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ شیخ صاحب نے بڑی بے چارگی سے کہا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ وہ بہت زیادہ غم زدہ ہو رہے تھے۔

ہم پشاور تو نہ گئے وہیں کوہِ مری میں ہی گھومتے رہے مگر ہمّت نہ پڑتی تھی کہ ہسپتال جا سکیں۔ کوئی ایک ہفتے بعد ہم نے آخر ایک دن ہسپتال میں ٹیلیفون کر کے پوچھا کہ اس لڑکے کا کیا حال ہے جسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ تو ہمیں یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ وہ صحت یاب ہو کر گھر جا چکا ہے۔ شیخ صاحب نے اس خوشی میں اس دن مجھے مٹھائی کھلائی اور ہم دونوں دوست اسی روز کوہ مری سے چل پڑے۔ ہم نے سکھر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس علاقے میں ہمارا رہنا ہمارے حق میں مفید ثابت نہ ہو سکتا تھا کہ وہ لڑکا کسی وقت بھی کسی چوراہے میں انگلی اٹھا کر یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ رہا وہ مونچھل اور وہ رہا وہ موٹا گیدڑ جنہوں نے مجھے اغوا کیا تھا۔

وہ دن گیا اور آج کا آیا۔ ہم نے پھر کبھی کسی کے بچے کو اغوا کرنے کی بات نہیں سوچی۔ شاید یہ ہماری اسی توبہ کا پھل ہے کہ سکھر پہنچ کر ہم نے صرف پچاس روپوں سے جو کاروبار شروع کیا تھا، اس میں اللہ نے اتنی برکت دی کہ آج ہم بھی سیٹھ بن گے۔

چاند کی سیر

چاند پر پہنچ کر جس جگہ خلائی جہاز اُترتے رہے وہاں ایک چھوٹی سی وادی بن گئی تھی اور اب ان وادی میں ایک محفوظ مقام پر بیٹھ کر پروفیسر کارٹر اس کے دونوں بیٹے فریڈ اور ایلن اور ایک مشہور سائنس دان ڈاکٹر ساونڈرز تجربے کرتے رہتے تھے۔ ایک دن کسی بات پر خوش ہو کر کارٹر نے اپنے دونوں بیٹوں کو کچھ دیر کے لیے آس پاس کے علاقے میں گھومنے پھرنے کی اجازت دی لیکن ساتھ ہی تاکید کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو زیادہ دُور نہ جانا۔ ایسا نہ ہو تم دونوں کسی مصیبت میں پھنس جاؤ۔“

”آپ فکر نہ کریں ابّا جان۔ ہم احتیاط سے کام لیں گے۔“ ایلن نے کہا۔ اس کی عمر سولہ سال تھی اور فریڈ اس سے تین سال چھوٹا تھا۔ وہ بڑی ضد کر کے اپنے ابّا کے ساتھ خلائی جہاز میں بیٹھ کر چاند کی سیر کے لیے آیا تھا۔ مگر ان کا باپ فکر مند تھا کہ بچّے ناسمجھ تو ہوتے ہی ہیں۔ پتا نہیں کسی وقت کیا کر بیٹھیں۔

دونوں بھائی اپنے خلائی لباس میں بھُوت سے بنے ہوئے ایک چھوٹی سی گاڑی میں بیٹھ کر کیمپ سے کافی دور نکل گئے۔ چاند ان کے خواہوں کی دُنیا تھی جس کے متعلق زمین پر انہوں نے بڑی خوبصورت کہانیاں سن رکھی تھیں وہ اس کے چپّے چپّے سے واقف ہونا چاہتے تھے اور ان کے ابّا نے کئی ہفتوں کے بعد ان کو سیر کی اجازت دی تھی۔ اس لیے وہ بے حد خُوش تھے۔

یہ کیمپ چاند کے جنوبی حصّے میں بنایا گیا تھا اور اس وادی کا نام جنسان رکھا گیا تھا جس کا مطلب تھا وہ جگہ جہاں جن اور انسان اکٹھے رہیں۔ مگر یہ ان کا وہم تھا۔ کیونکہ انہوں نے ابھی تک وہاں کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی تھی جسے جن کہا جا سکے۔ ان لوگوں کو چاند پر رہتے ہوئے چھ ماہ گزر چکے تھے. اب وہ زمین پر واپس جانے ہی کو تھے تاکہ وہ اپنی حکومت کو چاند کے متعلق ساری معلومات بتا سکیں۔ اس عرصہ میں وہ چاند کے تاریکی حصّے کو بھی دیکھ چکے تھے اور وہاں ٹاچُو کے مقام پر انہوں نے ایک اڈّہ بھی قائم کر دیا تھا۔ اب وہ جنسان میں بھی ایک اڈّہ بنا رہے تھے اور جلد از جلد اس کام کو ختم کرنے کے لیے دن رات محنت کر رہے تھے۔

”بھئی میرا تو خیال ہے کہ ہم اس گاڑی کو یہیں چھوڑ دیں۔“ ایلن نے کہا۔

وہ براہِ راست ایک دوسرے سے بات نہ کر سکتے تھے کیونکہ ان کی آواز خلائی لباس سے باہر نہ نکل سکتی تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے پاس ایک ایک چھوٹا سا وائرلیس کی قسم کا آلہ رکھا ہوا تھا جس سے وہ ایک دوسرے سے بات چیت کر سکتے تھے۔

”ہاں یار میں تو اس لباس ہی سے تنگ ہوں۔ اُوپر اس بند ڈبے جیسی گاڑی میں بیٹھنا عذاب سے کم نہیں ہے۔“ فریڈ نے کہا۔ انہوں نے زمین پر کبھی کاہے کو ایسی پابندیاں دیکھی ہوں گی کہ سر سے پاؤں تک وہ ایک سخت غلاف میں بند تھے جس میں سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے اُنہیں سخت کوفت ہوتی تھی۔ خلائی لباس زمین کے لباس کی طرح آرام دہ تو نہ تھا۔

وہ دونوں گاڑی سے نکل کر پیدل چلنے لگے۔

”وہ تمہارا بیلچہ اور ہوا اور پانی کی بوتل تو ٹھیک ہیں نا ان کو اچھی طرح دیکھ لو۔“ ایلن نے کہا۔ ان دونوں کے پاس ایک ایک بیلچہ، ہوا اور پانی کی بوتلیں اور

وائرلیس ریڈیو سیٹ موجود تھے۔ ہوا کی ٹنکی کمر پر بندھی تھی اور باقی چیزیں وہ گردن میں لٹکائے پھرتے تھے۔

"سب کچھ ٹھک ہے یار گاڑی تو بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ میرا خیال ہے تھوڑی دیر یہاں بیٹھ کر آرام کرلیں۔" فریڈ نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے تم اتنے میں ذرا اپنا ریڈیو بھی دیکھ لو کہیں خراب نہ ہو جائے۔ ہر شے ٹھیک ٹھاک رہنی چاہیے۔" ایلن بولا۔ یہ کہہ کر وہ اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ ارے بھائی تم کدھر جا رہے ہو؟ کچھ ہوش کرو بھٹک گئے تو قیامت تک نہ مل سکیں گے۔" فریڈ نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو یار میں یہیں ہوں۔" ہیڈ فون پر ایلن کی آواز سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ فریڈ کی نظروں کے سامنے ایلن آگے بڑھ کر ایک ٹیلے پر بیٹھنے لگا تھا کہ اچانک نیچے گر گیا جیسے وہ ٹیلا نہ تھا کوئی بادل تھا جس پر پاؤں نہیں رکھ سکتے۔ پھر فریڈ کی نظروں کے سامنے کچھ دھول ایک دھماکے کے ساتھ بگولے کی

طرح اُٹھی۔ فریڈ گھبرا کر اُٹھا اور خوف زدہ ہو کر اس دھول کو دیکھنے لگا جو اوپر ہوا نہ ہونے کی وجہ سے ایک دم بیٹھ گئی تھی۔ ایلن بھی دھماکے سے چونک اُٹھا۔

"دھول کا یہ ڈھیر جسے تم ٹیلہ سمجھ رہے تھے اسی صورت میں ہزاروں سال سے پڑا تھا اسے نہ کسی نے دیکھا تھا نہ چھوا۔" فریڈ نے کہا۔

"یہاں تو ہر شے جادُو کی بنی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ ہوتی کچھ اور ہے نظر کچھ اور آتی ہے۔" ایلن نے کہا وہ اب سامنے کی پہاڑی پر دیکھنے لگا تھا۔ جس کی چوٹی دھوپ میں سنہری نظر آتی تھی۔ چاند کی بے ہوا زمین اور اس کے پہاڑوں پر اُس کی نظریں پھسل رہی تھیں۔ ذرہ ذرہ اسے الگ الگ نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے گھٹنے جھکا کر اس ٹیلے کے قریب ہی سے نیچے ڈھلان پر چھلانگ لگا دی۔ مگر وہ نیچے گرنے کی بجائے بیس پچیس فٹ اوپر خلا میں اُچھل گیا۔ جہاں وہ پہلے کھڑا تھا وہاں ایک سوراخ سا پڑ چکا تھا اور اس سوراخ میں سے نظر آنے والی کوئی گیس سی نکل رہی تھی جسے ایلن بالکل نہ سمجھ سکا کہ کیا ہے۔ اس چھلانگ سے اسے وہ ورزشیں یاد آ گئیں جو ان سے چاند پر پہنچ کر کروائی گئی تھیں تاکہ وہ وہاں کے حالات کے

عادی ہو سکیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کا بھائی اسے واپس آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

"ایلن میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ آگے نہ جانا۔ ذرا ٹھہرو میں آ رہا ہوں۔ کہیں ہم جدا نہ ہو جائیں۔" یہ کہہ کر فریڈ نے ایک چھلانگ لگائی اور ایلن سے تھوڑی دور پہنچ کر رک گیا جو اب نیچے آ چکا تھا۔ چاند پر ہوا اور کششِ ثقل بہت کم ہونے کی وجہ سے انہیں چلنے پھرنے میں بہت آسانی تھی۔ وہ ایک قدم اُٹھاتے تھے تو دس قدم آگے نکل جاتے تھے۔

"میں نے اپنا سامان دیکھ لیا ہے۔ ہم اگلے دس گھنٹوں تک اسی رسد پر زندہ رہ سکتے ہیں۔ اب کدھر چلیں۔" فریڈ نے کہا۔

"چلو اس گڑھے کے پاس جو اونچا ٹیلہ ہے نا اس پر چڑھتے ہیں۔ شاید اس بلندی پر سے دوسری طرف رہنے والی کوئی مخلوق ہمیں نظر آ جائے۔" ایلن نے کہا۔

”ہاں یار یہ بات ناممکن ہے کہ یہاں کوئی مخلوق آباد نہ ہو۔ اللہ میاں نے اتنا بڑا چاند بے فائدہ تو نہیں بنایا۔ آج نہیں تو ہو سکتا ہے ہزاروں سال پہلے یہاں کوئی مخلوق رہتی ہو۔“ فریڈ نے کہا۔

”دعا کرو یار ہمیں کوئی ایسی چیز مل جائے مثلاً یہاں کے پرانے باشندوں کی ہڈّیاں یا ان کے برتن یا کوئی اور چیز۔ اگر ایسا ہو جائے تو ہم ساری دنیا میں مشہور ہو سکتے ہیں۔ ہر آدمی ہمیں سر آنکھوں پر بٹھائے گا۔“ ایلن نے بڑی آرزو سے کہا۔

ہماری ایسی قسمت کہاں بھائی مگر پھر بھی چلو اس ٹیلے پر چڑھ کر دیکھتے ہیں۔“ فریڈ نے کہا اور وہ دونوں بھائی دو دو سو گز لمبی چھلانگیں لگاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

”بس پریوں کی کسر باقی ہے ورنہ ہم پرندوں سے زیادہ تیز اُڑ سکتے ہیں۔“ ایلن نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اپنی زمین پر تو چلنا بھی بوجھل معلوم ہوتا ہے مگر یہاں تو ہم فرشتوں کی طرح اُڑ سکتے ہیں۔ کہیں ہم فرشتے تو نہیں بن گئے۔“ فریڈ نے کہا۔

ٹیلے پر چڑھ کر انہوں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ان کے سامنے چاند کا لمبا چوڑا میدان پھیلا ہوا تھا۔ اُوپر افق تک آسمان سیاہ نظر آتا تھا۔ سر پر دوزخ کی طرح تپتا جلتا پیلا سورج تھا۔ حدِّ نظر تک پھیلے ہوئے سیاہ آسمان میں ساکن ستارے اس بے آباد اور بنجر چاند کو حیرت سے تک رہے تھے۔ جس سے زمین والے بے حد پیار کرتے ہیں۔

"فریڈ ذرا نقشہ نکال کر دیکھو یہ کونسی جگہ ہے اور ہمارے سامنے کون سی وادی ہے۔" ایلن نے کہا۔ فریڈ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ فریڈ نے اپنے خلائی لباس کی انگلیوں کے ساتھ دھات کی چھوٹی سی نرم چادر جیب سے نکال کر کھولی جس پر چاند کا نقشہ بنا ہوا تھا۔

"اس جگہ کو 'پلکومنی' وادی کہتے ہیں اور وہ سامنے کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کو الٹائی پہاڑ کہتے ہیں۔ مگر ایلن یہ تو بڑا ناہموار اور خشک مقام ہے۔ اپنی زمین پر تو اتنی بلندی پر ہوا ٹھنڈی اور لطیف ہوتی مگر یہاں ہوا کا نام تک نہیں۔ بس ہر طرف سورج دیوتا آگ برساتے پھر رہے ہیں۔" فریڈ نے کہا۔

”ارے ارے یار! ذرا میرا ہاتھ پکڑنا ایلن! میں گر رہا ہوں۔ بھائی مجھے بچاؤ۔“ ایلن کے کانوں میں اچانک فریڈ کی گھبرائی ہوئی آواز گونجی۔

”ارے میں تو اوپر ہی اوپر جا رہا ہوں۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ ایلن ارے خدا کے لیے کچھ کرو میں نے نہیں آ سکتا۔ لو میں رسی پھینکتا ہوں۔ مجھے نیچے کھینچ لو۔ رسّی پکڑ لو ایلن خُدا کے لیے جلدی کرو۔“ فریڈ نے چیخ چیخ کر ایلن سے کہا۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ نظر آتا تھا۔ ایلن حیران پریشان نگاہوں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے تو اس کا جی چاہا کہ وہ خوب زور سے ہنسے کہ وہ اچھا خاصا تماشا نظر آ رہا تھا۔ جب وہ چاند پر آئے تھے تو شروع شروع میں اس طرح چھلانگ لگا کر اُونچا اُڑنے سے وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ مگر اِس اڑان میں اور اُس اڑان میں بہت فرق تھا۔ فریڈ اتنا اونچا تو کبھی بھی نہ اُڑ سکا تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے پوری قوّت سے چھلانگ لگائی ہو مگر پھر بھی کوئی اتنا اُونچا کس طرح اُڑ سکتا ہے۔ ایلن نے خوفزدہ ہو کر سوچا۔ اس کے سامنے فریڈ نے رسّی نیچے پھینکنے کی کوشش کی مگر رسّی ذرا بھی نیچے نہ آئی تھی بلکہ وہ فریڈ کے سر سے بھی اُونچی اُڑنے لگی تھی۔

"یار فریڈ یہ مذاق بند کرو اور اب نیچے آ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں کچھ ہو جائے۔ اگر تمہارے پاس کوئی جادو ہے تو اس کو اور زیادہ نہ آزماؤ۔ اگر تم نے اپنا راکٹ پستول چلا لیا ہے تو بھی بتا دو یہ بات ٹھیک نہیں ہے کہ تم مجھے خواہ مخواہ پریشان کر رہے ہو۔ اب بھلی نیّت سے نیچے آ جاؤ ورنہ میں ابّا سے شکایت کر دُوں گا۔" ایلن نے فون پر فریڈ سے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں کوئی مذاق نہیں کر رہا ہوں ایلن۔ میں نے راکٹ پستول نہیں چلایا۔ میں نے نقشہ کھولا تو اس وقت میں نے ایک جگہ جو اپنا پاؤں رکھا تو میرے قدم اُکھڑ گئے اور میں آپ ہی آپ ہوا میں اُڑنے لگا۔ ارے اب تو میں اتنا اُونچا ہو چکا ہوں کہ تم بھی مشکل سے نظر آتے ہو۔ مجھے بچاؤ! خدا کے لیے کچھ کرو۔" فون پر فریڈ کی سہمی ہوئی آواز ایلن نے سُنی جو ہر لمحے کمزور اور دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ سورج کی تیز دھوپ سے بچنے کے لیے ایلن نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر غور سے اُوپر دیکھا تو اسے اپنا بھائی ایک نقطے کی طرح دور بہت دُور خلا کی بلندیوں میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح اُڑتا نظر آیا۔ وہ ہر گھڑی اس کی نگاہوں سے دور اور دور ہوتا جا رہا

تھا۔ اب اسے محسوس ہوا کہ اس کے بھائی کی جان سخت خطرے میں تھی۔ خدا ہی خیر کرے۔ یہ میرے بھائی کو کون سی بلا اُچک کر لے گئی ہے۔ اس نے سوچا۔ چاند کے سیاہ آسمان اس کی بے ہوا فضا اور ساکن ستاروں کے ہجوم میں فریڈ کسی آسیب زدہ روح کی طرح آہستہ آہستہ غائب ہوتا جا رہا تھا۔ بہت دور حدِّ نظر سے بھی دور۔ ایلن کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

وہ اسے کس طرح بچائے۔ کیا طریقہ اختیار کرے۔ اس کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی۔ گھبراہٹ میں اس نے بیلچے سے اپنے ارد گرد کی بہت سی زمین کھود ڈالی کہ شاید اسے فریڈ کے اُوپر اُڑنے کا راز معلوم ہو سکے مگر کچھ بھی نہ ہوا۔

فریڈ اب نظروں سے بالکل ہی اوجھل ہو چکا تھا۔ اس سے اب فون پر بھی بات نہ ہو سکتی تھی۔

ایلن تیزی سے اس گاڑی کی طرف لپکا جس میں بیٹھ کر وہ وہاں پہنچے تھے۔ گاڑی میں ایک طاقتور ٹرانسمیٹر لگا ہوا تھا۔ اُس نے فون اُٹھا کر بار بار فریڈ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ اتنی دور جا چکا تھا کہ کوئی آواز



اس تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ ایلن تین گھنٹے وہاں بیٹھا بھائی کی واپسی کا انتظار کرتا رہا مگر اسے نہ آنا تھا نہ آیا۔ آخر اس نے مایوس ہو کر اس جگہ کے ارد گرد جہاں سے فریڈ اُڑا تھا کئی جھنڈیاں گاڑ دیں اور اسی طرح تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جھنڈیاں گاڑتا ہوا اپنی گاڑی میں بیٹھ کر کیمپ کی طرف دوڑا۔

اب فریڈ کی سنئے۔ اس بے چارے کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اُوپر نہیں اُڑ رہا بلکہ نیچے گر رہا تھا اور نیچے اور نیچے لامحدود خلا میں لڑھکتا ہی جا رہا تھا۔ اُسے پہلے تو خوشی ہوئی کہ شاید اس میں اُڑنے کی قوّت پیدا ہو گئی تھی مگر اس کی یہ خوشی دیرپا ثابت نہ ہوئی کیونکہ اسے جلدی ہی معلوم ہو گیا کہ وہ چاند سے بہت دور جا چکا ہے۔ اس چاند سے جہاں اس کا بھائی اور اس کا باپ اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ رسّی بھی اس کے ساتھ ہی چاند سے باہر گر رہی تھی اور وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں جا کر گرے گا۔ زمین دیا مریخ پر یا زہرہ پر۔ اب تو وہ چاند کے اُفق تک جا پہنچا تھا۔ اس نے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کی مگر اس کا جسم تو جیسے پتھر کی طرح سخت ہو چکا تھا۔ صرف دماغ ہی کام کر رہا تھا اور بس ورنہ ہاتھ پاؤں بالکل

اکڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ ٹوٹے ہوئے ستارے کی طرح تیزی سے بڑھتا چلا جارہا تھا۔

پھر اُسے سات رنگے کمان کی طرح قوس قزح نظر آئی۔ یہ نظّارہ وہ چاند پر آتے ہوئے بھی دیکھ چکا تھا مگر اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آرہا تھا۔ وہ کچھ اور اُونچا اُڑا تو اُسے اپنے سامنے رنگ و نور کے سیلاب میں نہائی ہوئی اپنی پیاری زمین نظر آئی۔ فریڈ اس منظر کو دیکھ کر تڑپ اُٹھا۔ زمین ایک طشتری کی طرح نظر آرہی تھی جو سبز سنہرے نیلے پیلے رنگوں میں دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ اب اُس کے سامنے بحرِ اوقیانوس تھا۔ پھر اُسے شمالی اور جنوبی امریکہ کے وسیع میدان نظر آنے لگے۔ وہ چاند کی حدود سے نکل کر شاید مدار میں پہنچ چکا تھا۔ پورا گلوب اس کے سامنے گردش میں تھا۔ ایک لمحے میں سارا یورپ افریقہ ایشیا اور ہمالیہ اس نے دیکھ لیے۔ گویا ساری کائنات اس کے سامنے ایک کتاب کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ بادلوں نے زمین کے کچھ حصّوں کو یوں گھیر رکھا تھا جیسے سفید روئی کے لباس میں کوئی خوبصورت بچّہ لیٹا ہوا ہو۔ میں کہیں خواب تو نہیں

دیکھ رہا۔ فریڈ نے سوچا یہ کچھ ایک دم کیسے ہو گیا۔ میں جاگ رہا ہوں۔ میرے حواس کام کر رہے ہیں۔

اور پھر آہستہ آہستہ زمین بھی اُس کی نظروں سے اوجھل ہونے لگی۔ کچھ عرصہ تک نہ اسے چاند ہی نظر آیا نہ ہی زمین۔ وہ بیکراں خلا میں بغیر کچھ دیکھے سمجھے نامعلوم سمتوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بڑھ کیا رہا تھا بے اختیار ہو کہ کھنچتا جا رہا تھا اور پھر آہستہ آہستہ اسے چاند دوبارہ نظر آنے لگا۔ وہ چاند جو اتنے فاصلے پر بالکل تاریک نظر آ رہا تھا آہستہ آہستہ زیادہ واضح زیادہ روشن دکھائی دینے لگا۔ ایک بار پھر اسے چاند پر ٹاچو کا کیمپ نظر آیا۔ میں شاید واپس جا رہا ہوں۔ مگر یہ معاملہ کیا ہے؟ فریڈ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا تھا۔ مگر ان کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی۔ اب اسے جنسان کی وادی بھی سامنے نظر آ رہی تھی۔ پھر اسے وہ ٹیلہ بھی دکھائی دینے لگا جہاں سے وہ بگولے کی طرح اُوپر اُٹھ گیا تھا۔

اوہ میرے اللہ۔ تیرا شکر ہے کہ میں گھر واپس آ گیا ہوں۔ وہ مجھے پھر سے نظر آنے لگے ہیں۔ شاید میں کچھ عرصے کے لیے اندھا ہو گیا یا سو چکا تھا۔ میری

آنکھوں کی روشنی واپس آ گئی ہے۔ میں اس خواب سے بیدار ہو چکا ہوں۔ فریڈ نے سوچا۔ اس ٹیلے پر اُسے خلائی جہاز کھڑا نظر آیا۔ اس کا باپ اور ایلن اور سانڈرز اپنے تمام ساز و سامان کو ساتھ لے کر اُسے بچانے کے لیے اس ٹیلے پہنچ چکے تھے۔ اُنہوں نے فریڈ کو دیکھا کہ وہ عین خلائی جہاز کے اوپر بڑے زور سے گرے گا۔ اس ڈر سے کہ کہیں خلائی جہاز کے نوکیلے کَل پرزوں پر ِگر کر فریڈ زخمی نہ ہو جائے، وہ فوراًاس جہاز میں بیٹھ کر اسے وہاں سے ہٹانے لگے۔ فریڈ نے سوچا شاید وہ اسے وہیں چھوڑ کر دور جا رہے ہیں۔ وہ گھبرا کر فون پر بولا۔

"ابّا جان میں آ گیا ہوں۔" وہ پوری قوّت سے چلّایا مگر وہ خلائی جہاز اس ٹیلے سے سرک کر دور چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ فریڈ پھر اوپر اٹھنے لگا۔ اب تو فریڈ کا خوف کے مارے بدن میں خون جمنے لگا۔ مُصیبت کی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ بے چارا ننا سمجھ بچہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا پچھلے کئی گھنٹوں سے فضا میں لٹک رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کی نگاہوں کے سامنے سے

خلائی جہاز، جنسان کی وادی، چاند کی پہاڑیاں، غرضیکہ ہر شے غائب ہونے لگی اور ایک بار پھر وہ لا محدود خلا میں بے سہارا کشتی کی طرح ہچکولے کھانے لگا۔

"لڑکے کی اس مصیبت کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہو گی جسے معلوم کرنا ہمارا فرض ہے۔" سانڈرز نے حیران ہو کر کہا۔ فریڈ کا باپ چیخ چیخ کر اپنے لختِ جگر کو بُلا رہا تھا جو لحظہ بہ لحظہ دور ہوتا جا رہا تھا۔ پھر بولا۔

"یہاں کوئی ایسی شیطانی طاقت ہے جو میرے بیٹے کو پریشان کر رہی ہے۔ ایلن ایک دفعہ پھر سارا واقعہ تفصیل سے بتاؤ کہ ماجرا کیا ہوا تھا۔ فریڈ کے پاس ہوا کی بوتل صرف تین گھنٹے اور چل سکے گی۔ اس کے بعد اس کا زندہ رہنا ناممکن ہو گا۔ ہمیں ان ہی تینوں گھنٹوں میں اُسے واپس لانا ہو گا۔" کارٹر نے پریشان ہو کر کہا۔

ایلن نے ایک بار پھر سارا واقعہ اپنے ابّا کو سنایا پھر وہ اچانک بڑی اونچی آواز سے بولا۔

"ابّا جان اُدھر دیکھیے، جس ٹیلے پر ان کا خلائی جہاز پہلے کھڑا تھا وہاں کچھ جگہ جل سی گئی تھی اور درمیان میں ایک سیاہ سوراخ بن گیا تھا جس کے گرد سیاہ دھول اُٹھتی بیٹھتی نظر آتی تھی۔

وہ سب بھاگ کر اس جگہ کے قریب پہنچے۔ ایلن نے یونہی بغیر سوچے سمجھے اس سوراخ پر اپنا بیلچے رکھ دیا۔ وہ بیلچہ ایک دم ہوا میں اُڑا اور پھر ایک طرف سے زیادہ وزنی ہونے کی وجہ سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر نیچے ِگر گیا۔ پھر ایلن نے چاند کا نقشہ کھول کر دھات کی پُوری چادر اس سوراخ پر پھیلا کر پھینکی تو وہ اتنی تیزی سے اُڑی کہ پھر نظر نہ آئی۔

"ابّا جان اگر آپ میری بات مانیں تو خلائی جہاز کو جو بہت وزنی ہے اس سوراخ پر لا کر کھڑا کر دیں۔ فریڈ نیچے آجائے گا۔" ایلن نے کہا۔

سانڈرز جو اب تک ایلن کی حرکتوں اور اس سوراخ پر سے اُڑنے والی چیزوں کو غور سے دیکھ رہا تھا ایک دم چونک اُٹھا اور بولا:

”بھئی واہ! اس لڑکے نے کمال کر دیا ہے۔ بہت خوب کارٹر صاحب۔ اس جہاز کو اِدھر لا کر اس سوراخ پر کھڑا کر دیں۔ میں سارا معاملہ سمجھ چکا ہوں۔“

”مگر میرے پلّے تو کچھ نہیں پڑا بھئی، اصل بات کیا ہے؟“ کارٹر نے کہا۔

”آپ کے بیٹے کی عقل مندی کی داد دینی چاہیے۔ جناب آیئے پہلے اس جہاز کو یہاں لاتے ہیں تاکہ فریڈ کو اس مصیبت سے چھٹکارا مل سکے پھر آپ کو ساری بات بتائیں گے۔ چلیں جلدی کریں۔“ سانڈرز نے کہا۔

چند ہی لمحوں میں خلائی جہاز نے ٹیلے کے پاس گڑھے میں اس چھوٹے سے سوراخ کو ڈھانپ لیا۔ وہ سب پُر اُمّید نظروں سے خلا میں گھورنے لگے۔ فریڈ جو اب تک نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا کچھ دیر بعد پھر فضا میں نمودار ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ نیچے اُترنے لگا۔ انہوں نے خلائی جہاز کے اوپر چڑھ کر فریڈ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور نیچے اُتار کر اُسے پیار کرنے لگے۔

”خُدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے بیٹے کی جان بچ گئی۔“ کارٹر نے فریڈ کا منہ سر چوم کر کہا۔

"بھئی یہ کیا راز تھا سانڈرز۔ تم لوگ میرے بیٹے سے شرارت کر رہے تھے۔ کیوں ایلن ٹھیک ہے نا۔ تم سدا کے شریر لڑکے ہو۔" کارٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں ابّا جان۔ ہم نے کوئی شرارت نہیں کی۔ آپ چچا جان سے پوچھ لیں۔" ایلن نے کہا۔

"ایلن ٹھیک کہتا ہے کارٹر صاحب۔ بات یہ ہے کہ اس سُوراخ میں سے جو دھول اُٹھتی بیٹھتی نظر آتی ہے وہ کسی بُہت ہی طاقتور گیس کا دھواں ہے جو اپنے سامنے آنے والی چیزوں کو بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اُوپر اُڑا سکتی ہے۔ فریڈ کہیں بے خیالی میں اس سوراخ پر کھڑا ہو گیا۔ اس گیس نے اسے ایک دم میلوں اُوپر اُچھال دیا۔ کیوں ایلن ہے نا یہی بات۔" سانڈرز نے کہا۔

"ہاں ہاں چچا جان۔ میں بھی یہی کچھ سمجھا ہوں اور حقیقت بھی یہی ہے۔" ایلن نے کہا۔

کارٹر نے یہ بات سنی تو بولا۔

”بھئی حد ہو گئی اِتنی سی بات بھی میرے خانے میں نہ پڑ سکی۔ کمال ہے کہ میرے بیٹے مجھ سے ذہانت میں سبقت لے گئے ہیں۔“ پھر وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا۔

”ارے بیٹا! ایسی گیس کی تو ہمیں بے حد ضرورت ہے۔ اگر یہ ہمارے بس میں آ گئی تو ہمیں موٹروں، جہازوں، ریل گاڑیوں کے لیے پٹرول اور انجنوں کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ ہم سامان کو کسی گاڑی کے ڈبے میں رکھ کر پیچھے اس گیس کی ٹینکی لگا دیں گے اس کے زور سے گاڑی کا وہ ڈبّہ خود بخود تیزی سے منزلِ مقصود پر پہنچ جائے گا۔ چاند پر آنے کے لیے ہمیں خلائی جہاز میں استعمال کرنے کے لیے اس ایندھن پر بے شمار روپیہ صرف نہیں کرنا پڑے گا۔ اس گیس سے خلائی جہاز کہیں زیادہ سستے اور تیز چلا کریں گے اور ہم چند گھنٹوں میں چاند پر پہنچ جایا کریں گے۔ اس سوراخ میں تو اس گیس کی اتنی مقدار موجود نہیں ہو گی ورنہ تم یہ خلائی جہاز بھی خود بخود اُڑنے لگتا۔ مگر پھر بھی اس گیس کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔“

پھر چند لمحوں تک ارد گرد کی زمین کو دیکھتا رہا اور جب کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو کہنے لگا۔

”یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بیٹا۔ فریڈ نے یہ تکلیف اُٹھا کر قیامت تک تاریخ کے صفحوں میں اپنا نام سنہری حروف میں محفوظ کر لیا ہے۔ ساری دنیا میں تم دونوں کی شہرت کا ستارہ چمکے گا۔ لوگ فخر سے تمہارا نام لیں گے۔ ہم جلد ہی زمین پر جانے والے ہیں۔ وہ اس نئی دریافت کا حال سُنیں گے تو تم دونوں کو کندھوں پر اُٹھا لیں گے۔““میرا خیال ہے اس گیس کا نام لوئی نیر نیم رکھ دیں۔“ سانڈرز نے کہا۔

”واہ لوئی نیر نیم کیوں رکھیں۔ میں اس گیس کا نام فریڈ ایلیر نیم رکھوں گا تاکہ میرے بچوں کا نام ہمیشہ زندہ رہے۔“ کارٹر نے کہا۔

”ہاں یہ بہتر رہے گا۔ اس گیس کی دریافت کا سہرا ابھی اِنہی کے سر ہے۔ ہم تو بالکل بدھو نکلے۔ اب ہمیں اس گیس کو حاصل کرنے کا انتظام کرنا چاہیے۔“ سانڈرز نے کہا۔

”بھئی اب تو ایک کیمپ یہیں لگالو تاکہ ہم یہاں بیٹھ کر اس گیس پر اطمینان سے کام کر سکیں۔“ کارٹر نے کہا۔ اور وہ سب وہاں اپنا اڈّہ بنانے میں مصروف ہو گئے۔